سلطانہ کا خواب

رقیہ سخاوت حسین

ترجمہ : ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا

مشعل

سلطانہ کا خواب

رقیہ سخاوت حسین

ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

مشعل

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور ۵۴۶۰۰، پاکستان

MashalBooks.org

سلطانہ کا خواب

رقیہ سخاوت حسین

ترجمہ: ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

کاپی رائٹ © اردو ۔ ۱۹۹۹ مشعل

کاپی رائٹ © انگریزی ۱۹۹۸، بنگلہ اکیڈمی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

ناشر: مشعل

آر بی ۵، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور ۵۴۶۰۰، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

E-mail:mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

پیش لفظ

برسوں پہلے رقیہ سخاوت حسین نے جنوب ایشیا کی مسلمان عورتوں اور ان کی زندگی کے بارے میں جو کچھ اور سوچا تھا، آج وہ صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جس دنیا میں عورتیں رہتی ہیں، اس کی پہچان اور اس سے واقفیت کی خاطر رقیہ نے جو دریچے کھولنا چاہے تھے، اور جن حقیقتوں سے پردہ اٹھانا چاہا تھا، وہ آج کی خواہشوں اور آرزوؤں کی فہرست میں بھی شامل ہیں۔ انصاف کی طلب میں عورت بڑی لمبی مسافت طے کر چکی ہے، مگر اس کے مقام اور منزل کا تعین آج بھی بے یقینی کا شکار ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ خود عورتوں کا شکست خوردہ رویہ یا مردوں کے رویوں میں عدم تحفظ کا عمل دخل...... قطعی فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ بظاہر دونوں امکان ہی موجودہ تہذیبی صورت حال کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عورتوں نے اپنی زندگی کی پابندیوں کے باوجود اپنی زندگی تشکیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعے معاش کے وسیلوں تک اپنی محنت اور لیاقت سے رسائی حاصل کی، لیکن معاشرے میں جو اعتبار اور یقین ان کا حصہ تھا، وہ ابھی تک اس کا مقدر نہیں ہوا۔ اس بات کی وضاحت یہاں بہت ضروری ہے کہ تمثال بیان کی خاطر ایک اچھا حوالہ ہو، لیکن عورتیں، دنیا کو زنانہ اور مردانہ کی تقسیم میں نہ تو دیکھنا چاہتی ہیں اور نہ بنانا چاہتی ہیں۔ پروردگار نے یہ دنیا انسانوں کے لئے بنائی ہے اور عورتیں، بحیثیت انسان اپنا تعارف، حق اور مقام طلب کرتی ہیں۔ یہ ایسی ناروا بات نہیں، جس کے لئے انصاف نہ کیا جا سکے اور عورتوں کو انسان کا مساوی درجہ دینے میں کوئی قباحت پیدا ہوتی ہے۔

جنوبی ایشیا کی مسلمان عورتیں، تہذیبی ٹکراؤ کی وجہ سے ان روایتوں کی پابند کی گئیں جو ہمارے عقیدے اور فلسفہ اخلاق سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مردوں

کے محکوم معاشرے کو یہ فضا راس آتی گئی اور آخر روایت اور حقیقت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا اور اصول پر رواج غالب ہوتا گیا۔ رقیہ سخاوت حسین نے اس تجزیے کی ابتدا کی تھی کہ تہذیبی رویوں کو چھان پھٹک کر دیکھا جائے تا کہ معاشرتی مفاہمت ہموار ہو سکے اور برتر اور بدتر کا وہم اور خوف، زندگی کو زنگ نہ لگا سکتے۔ معاشرتی بے چینی، ترقی کی رکاوٹ بنتی ہے اور ترجیحات غیر مرتب ہو کر ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کی صورت حال کو بے ترتیب کر دیتی ہیں۔

عورتوں کی زندگی معاشرے کی مجموعہ زندگی سے الگ اور تنہا نہیں ہے۔ اگر معاشرے کی تکمیل منظور ہے تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ یقین اور اعتبار کے ساتھ کاروبار زندگی میں شریک ہو سکتے ہیں کہ ایک دوسرے سے شکایت اور بے اعتباری کا موقعہ ہی پیدا نہ ہو۔

یہ امید آج بھی زندہ ہے بے تاب ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کی صلاحیتیں، معاشرے کی تعمیر اور ترقی کے لئے بروئے کار ہو سکیں۔ اگر ہمارے اندر متوازن ترقی پانے کی خواہش شدید ہے تو انصاف کو بھی معاشرتی سطح پر توازن کے ساتھ عام کرنا ہوگا اور اس وقت رقیہ سخاوت حسین کے خواب تعبیر پا سکیں گے اور ان کی زندگی بھر کی کوششیں بار آور ہو سکیں گے۔

عارفہ سیدہ

لاہور

MashalBooks.org

دیباچہ

اس کتاب میں ہم پردے...... عورتوں کی علیحدگی اور ''عزلت نشینی'' کو تین لوگوں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ایک تو بیسویں صدی کے اوائل کی مسلمان مصنف کی نظر سے، جو پردے کی واقف حال تھی اور جس کے خلاف انہوں نے زندگی بھر مہم جاری رکھی۔ دوسرے آج کی ایک بنگلہ دیشی عورتوں کے حقوق کی علمبردار مصنف اور تیسرے شمالی امریکہ کی ایک نسائیت کے حق میں نعرہ زن سوشل سائنٹسٹ کی نظر سے جو جنوبی ایشیا اور پردے دونوں کی واقف حال ہیں۔

یہ بات انتہائی اہم ہے کہ رقیہ سخاوت حسین کو وسیع پیمانے پر متعارف کرایا جائے۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کے خیالات اہم ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کی مختصر کہانی ''سلطانہ کا خواب'' عورتوں کی افلاطونی دنیا کا قصہ ہے۔ یہ تحریر نسائیت کی مشہور علمبردار شارلٹ پرکنز گل مین کے ناول ''ہرلینڈ'' سے بھی دس برس پہلے لکھی گئی۔ان حساس خاتون کو، جو عورتوں کے حقوق میں آواز اٹھانے والی پہلی مصنف ہیں، زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں کے لئے میسر کرنا، غفلت کی طویل مدت کی تلافی کے لئے ہے۔ یہ بات بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ نسائیت کا احساس، اپنے ملک سے بھی جنم لے سکتا ہے اور اس کے لئے غیر ملکی رسوخ پر تکیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہم اس کتاب کو تین طرح کے پڑھنے والوں کے لئے سودمند سمجھتے ہیں۔ان استادوں اور طالب علموں کے لئے جو ایسے ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں جس کا موضوع اور مصنف عورت ہے۔ یہاں ایک نسبتاً کم معروف ایشیائی مصنف کا پس منظر کے حوالے سے تعارف منظور ہے۔ ایشیائی ادب اور زندگی کا مطالعہ کرنے والے، ان استادوں اور طالب علموں کے لئے جو ایشیا میں نہیں رہتے یہاں اضافہ یہ ہے کہ عورتوں کے تجربے کو نمایاں کیا جائے، جو اکثر نظر انداز کیا جاتا

ہے۔ایشیا میں رہنے والے پڑھنے والوں کے لئے، ایک ایسی مصنف کا تعارف، بنگال کی ثقافت اور بنگالی زبان کے دائرہ کار سے باہر زیادہ متعارف نہیں ہے۔ مگر جس کا تجربہ جنوبی ایشیا کی تہذیب کی گونج لئے ہوئے ہے۔

تینوں طرح کے پڑھنے والوں کے لئے، تاریخ کا احساس بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ پردے کی پابندی زمان ومکان کے لحاظ سے یکساں نہیں رہی۔ سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں سے عورتوں کی زندگیاں غیر متوقع تیز رفتاری سے اثر پذیر ہوتی ہیں اور یہ اثر ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ ''عزلت نشین'' میں رقیہ نے جن پردہ دار خواتین کا ذکر کیا ہے، اسے اس پس منظر میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہے کہ جنوبی ایشیا میں خود پردے کے رواج میں تیزی سے تبدیلی آتی رہی ہے۔ اس کی پابندی میں اختلاف اور تفریق بھی رہی ہے، صرف مختلف علاقوں کی ثقافتوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اسی معاشرے کے علاقائی اور طبقاتی فرق کی وجہ سے بھی نوعیت بدلتی رہی ہے۔ حالات کا عجب طنز یہ ہے کہ رقیہ نے پردے کی جس سخت پابندی کا ذکر اس صدی کے شروع کے حوالے سے کیا ہے وہ شاید بہت سے پڑھنے والوں کے لئے ناقابل یقین ہو، لیکن جن علاقوں میں پردہ کا سوال پھر سے متحرک ہو رہا ہے، وہاں کے رہنے والوں کے لئے اس کا تسلیم کر لینا عین ممکن ہے۔

''سلطانہ کا خواب''، ''ایک افسانہ''، ''عزلت نشین'' ایک سچی رپورٹنگ۔ یہ تحریریں ان دوصنفوں کی عکاس ہیں، جنہیں رقیہ نے اختیار کیا اور جو اس بات کا مظہر ہیں کہ رقیہ کی توجہ کا مرکز عورتوں کے ساتھ کی جانے والی بے انصافی تھی۔ ''سلطانہ کا خواب'' پردے کی کایا کلپ میں روشن جہاں نے رقیہ کے نئے پڑھنے والوں کے لئے یہ تعارف مہیا کر دیا ہے کہ رقیہ نے یہ کہانی کیونکر لکھی اور انگریزی میں لکھنے کی وجہ کیا تھی۔ انہوں نے کہانی کی ادبی وضاحت بھی پیش کر دی ہے۔ اسی طرح ''عزلت نشین: پردے کی پابندی'' میں جہاں نے پردے کے متعلق لکھی جانے والی دوسری عصری تحریروں کے مقابلے میں ان رپورٹوں کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ''رقیہ: ان کی زندگی

کا تعارف'' میں جہان نے ایک وسیع پیمانے پر رقیہ کی زندگی کو دیکھا ہے۔اس میں ان کی دوسری تحریریں، خیالات اور نسائیت کے تصور کا بھی احاطہ ہے اور آخر میں اپنے پس حرف: ''شہیر کو مقید کرنا..... ہمارے عہد کی کہانی'' میں حنا پاپنیک پردے کو ایک وسیع تر کینوس پر دیکھتی ہیں۔صرف پردہ کرنے کی رسموں میں جتنا تنوع پایا جاتا ہے، اسی پر نظر نہیں کی گئی، بلکہ پردے کا تصور جنوبی ایشیا کے باہر رہنے والوں کے فیصلوں پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا احاطہ کیا گیا ہے۔جنوبی ایشیا میں پردے سے متعلق پاپنیک کے اپنے مشاہدات میں وہ اقتباس بھی شامل ہیں، جہاں ایک خاتون نے اپنے شوہر کی خاطر بڑی بے دلی سے پردہ چھوڑا۔پس حرف میں پاپنیک نے ان مخفی قوتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔خاص طور پر سماجی اختیار، جنسیت اور تولیدی صلاحیت..... جوان معاشروں میں عورتوں اور مردوں کے تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہیں، جہاں پردے کی پابندی موجود ہے۔

یہ کتاب اب سے بہت پہلے لکھی جانا چاہیے تھی۔کیونکہ ہم دونوں اس کتاب کے موضوع سے ایک عرصہ سے دلچسپی رکھتی ہیں۔لیکن ہمارے کام اور خاندان کی مصروفیتوں نے مسودہ کی تکمیل کو دشوار بنا دیا۔اس کو مکمل کرنے کا ہمارا یہ فیصلہ اس تیز رفتار ابتری کا نتیجہ ہے جو دنیا میں بہت جگہ ثقافت اور مذہبی روایت کے حوالے سے عورتوں کے حقوق کے بارے میں پھیل رہی ہے۔ایک دفعہ پھر عورتیں اس خوف اور خفگی کا نشانہ بن رہی ہیں جو سماجی حالات میں تیز رفتار تبدیلی کی وجہ سے ظاہر ہو رہی ہے۔رجعت پسند حکومتیں اور بااختیار سماجی تحریکیں دنیا کے بہت سے حصوں میں، ایک دفعہ پھر اس کوشش میں ہیں کہ عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق سلب کر لئے جائیں۔یہ سب کچھ اس موہوم استحکام کی خاطر کیا جا رہا ہے جس کا تصور ایک دیومالائی ماضی سے وابستہ ہے۔

ہمارے کام کو اس جواب سے بھی بہت مدد ملی ہے، جو عورتوں پر اس تنقید کے ردعمل کے طور پر سامنے آیا ہے۔ایک تو عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جنوبی ایشیا میں، عورتوں کی

انجمنوں کا جال بچھ گیا ہے اور دوسرے عورتوں کے مسئلے پر تحقیق اور عمل دونوں کی رفتار تیز تر ہوگئی ہے۔ ہم دونوں ان تمام کاموں میں فعال طور پر شریک رہی ہیں۔ ہمیں اس کتاب کے بارے میں تبادلہ خیالات کا موقعہ بھی ملا، اور مسودے پر اظہار خیال کا موقعہ بھی۔

یہ کتاب ایک طویل رفاقت کا بھی نتیجہ ہے۔ ان پچھلے پچیس سالوں میں کہ ہم نے اور ہمارے خاندانوں نے ایک دوسرے کو جانا ہے، ایک دوسرے کے وطن میں گھوما پھرا ہے۔ اور ہم دونوں نے مختلف معاشروں میں عورت ہونے کی سرخوشی، اور عورت ہونے کے مسئلہ پر جی کھول کر بات چیت کی ہے، پردے کا سوال ہم دونوں کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوا۔ روشن جہاں کی بہن، رونق جہان نے جب ۱۹۶۰ء میں حنا پاپنیک کو اس افلاطونی کہانی کے بارے میں بتایا تھا تو اس وقت سے پردے کے کایا کلپ کی یہ کہانی، ہم دونوں کی بات چیت کا حصہ رہی۔

ان گزرتے سالوں میں، ہم پر دوستوں، خاندان اور رفقائے کار کی عنایتوں کا اتنا قرض چڑھ چکا ہے کہ اب ان سب کو یاد کرنا اسی طور ہوسکتا ہے کہ اعتراف تشکر کی ایک رسمی فہرست بنالی جائے۔

اپنے مضامین کے مسودوں پر اظہار رائے کے لئے ہم، ڈاکٹر انیس الزماں، پروفیسر شعبہ بنگالی ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈاکٹر رفعت حسن پروفیسر اور صدر ریلیجس سٹڈیز پروگرام لونیویل یورنیورسٹی، ڈاکٹر ملاویکا کارلیکر سنٹر فار ڈویلپمنٹ سٹڈیز نئی دہلی اور ڈاکٹر بروس پرے ڈیپارٹمنٹ آف ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیئن سٹڈیز یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے ممنون ہیں۔

بہت ساری وجوہات کی بناء پر ہم حمیدہ خالہ کے بے حد ممنون ہیں اور ان کے گھر والوں کے بھی کہ انہوں نے اس طرح کھل کر پردے میں گزرنے والی زندگی کے متعلق بات چیت کی۔ ہم ایلا بھٹ، جنرل سیکرٹری، سیوا احمد آباد کے بھی بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں یونین آرگنائزر والی کہانی سنائی۔

ہم بنگلہ اکادمی، ڈھاکہ کے بھی بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ''سلطانہ کا خواب'' اور

MashalBooks.org

''رقیہ رچناولی'' رقیہ کی تحریروں کا مجموعہ، سے دوسرے اقتباسات شائع کرنے کی اجازت دی۔ یہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں شائع کی تھی۔ ہم ڈھاکہ کے ایک ریسرچ گروپ ''وومن فار وومن'' کے بھی ممنون ہیں کہ جن کی معاونت سے روشن جہان نے ''عزلت نشینی میں: رقیہ سخاوت حسین کی اور درھ باسنیٰ'' شائع کی۔ یہ رقیہ کے منتخب مضامین کے ترجموں پر مشتمل ہے۔

ہم بنگلہ دیشی آرٹسٹ ثریا رحمان کے بھی شکرگزار ہیں کہ جنہوں نے کشیدہ کاری کا لحاف (نقشی کنتھا) ڈیزائن کیا۔ جس کا ایک حصہ کتاب کے کور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور اس گمنام بنگالی عورت کے بھی، جس نے سلائی کا سارا کام کیا۔ حنا پاپنیک، جو کشیدے کے اس کام کی مالک ہیں، انہوں نے کتاب کی جلد کے لئے اس کی تصویریں کھینچیں۔

رقیہ اور پردے پر اپنے کام کے دوران میں ہم دونوں کو سارے ادارکاروں کا تعاون میسر رہا۔ جس نے اس موجودہ کتاب کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ فورڈ فاؤنڈیشن (ڈھاکہ) کے ایک وظیفہ پر روشن جہان نے رقیہ کی تنقیدی سوانح پر، وزیٹنگ اسکالر کی حیثیت سے سنٹر فار ایشیئن ڈویلپمنٹ سٹڈیز، بوسٹن یونیورسٹی میں کام کیا۔ حنا پاپنیک کو ان کی تحقیق جو جنوبی ایشیا میں صنفی عزلت اور عورتوں کی علیحدگی کے متعلق تھی اسے نیشنل ایڈاؤمنٹ فار دی ہیومینیٹیز سے گرانٹ ملی۔

بین الاقوامی سطح پر انتظامی دشواریوں کے باوجود ہم ان تمام اداروں کے شکرگزار ہیں، جو اس سارے فاصلے کے باوجود ہمیں ورکشاپ اور مطالعاتی دوروں کے لئے سہولت مہیا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم تعلق یونائیٹڈ نیشن یونیورسٹی (ٹوکیو) کمپریٹو سٹڈی آف دومنز ورک اینڈ فیملی سٹریٹیجی ان ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا ہے جس میں ہم دونوں سرگرم طور پر شریک رہے۔ اسمتھسونین انسٹی ٹیوٹ اور امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین سٹڈیز کی حنا پاپنیک کے لئے، ایک اور تحقیق کے سلسلے میں مالی امداد بھی ہماری سپاس گزاری کی مستحق ہے۔

اور سب سے آخر میں ہم فلورنس ہاؤ، سوسنا ڈرائیور اور فیمینسٹ پریس کے عملے کے بے حد شکرگزار ہیں۔ انہوں نے جس صبر اور تعاون کا اس سارے وقت میں مظاہرہ کیا، جو ایک

دوسرے سے آدھی دنیا کے فاصلے پر رہنے والی، دو لکھنے والیوں سے حتمی مسودہ حاصل کرنے کے لئے درکار تھا۔

روشن جہاں بنگلہ دیش

حنا پاپنیک یو ایس اے

MashalBooks.org

روشن جہاں

سلطانہ کا خواب: پردے کی کایا کلپ

۱۹۰۵ء میں مدراس سے چھپنے والے ایک انگریزی رسالے The Indian Ladies Magazine میں ''سلطانہ کا خواب'' پہلی بار چھپا۔ ایک خاتون مصنف کی لکھی ہوئی، یہ پہلی افلاطونی کہانی ہے جسے شعوری طور پر نسائی مفادات کی خاطر لکھا گیا۔ یہ کہانی بلاشبہ ایک ہندوستانی خاتون کے قلم سے لکھی پہلی کہانی ہے۔ اس کی مصنفہ رقیہ سخاوت حسین (۱۸۸۰۔۱۹۳۲) بلاشبہ بنگال کی پہلی نسائیت کی علمبردار خاتون ہیں جنھوں نے عورتوں کی خاطر آواز اٹھائی۔ ذرا سی دیر کو یہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ ایک ایسی اصطلاح کا استعمال کیونکر نہ کیا جائے جو اپنے سیاق سے جڑی ہوئی ہے۔ ''نسائیت'' کی اصطلاح کے معنی مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہیں۔ لیکن پھر بھی یہی وہ اصطلاح ہے جو رقیہ کی تحریروں کو پڑھنے والے اب استعمال کرتے ہیں۔ جس وقت یہ کہانی چھپی ہے اس وقت تک رقیہ ایک مضمون نگار کی حیثیت سے پہچانی جا چکی تھیں۔ انہوں نے بنگالی زبان میں عورتوں کی زندگی کے جبر اور کم تر حیثیت کے متعلق لکھا اور خاص طور پر بنگال کی مسلمان عورتوں کے بارے میں۔

اس کہانی کے چھپنے کے بیس سال بعد ۱۹۳۰ء میں رقیہ کو اس کہانی کا لکھنا یاد آیا۔ جس وقت انہیں اس کا خیال آیا وہ اپنے گھر میں تنہا تھیں کیونکہ ان کے شوہر، خان بہادر سید سخاوت حسین، ڈپٹی مجسٹریٹ اپنے معائناتی دورے پر تھے۔ ضلع بھاگلپور کے ایک چھوٹے سے شہر بکا میں وہ تعینات تھے۔ یہ آج کے بھارت کے صوبہ بہار میں ہے۔ یہ نوجوان بنگالی خاتون خود کو اس

گھرانے میں تنہا محسوس کرتی ہوگی جہاں سارا خاندان اردو بولتا تھا۔ رقیہ اردو بول سکتی تھیں لیکن بنگالی ان کی اپنی زبان تھی۔ ''وقت گزارنے کو میں نے کہانی لکھ ڈالی۔'' اس کہانی کے لکھنے کی تحریک میں ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے غیر بنگالی شوہر کو، اپنی انگریزی کی مہارت دکھانا چاہتی تھیں کیونکہ وہ ہی تھے جنہوں نے انگریزی لکھنے پڑھنے کے لئے ان کی ہمت بندھائی تھی۔ وہ ہی ان کے سب سے پہلے، اور معترف سامع بھی تھے۔ دوسری وجہ شاید ہو کہ وہ مضمون کے علاوہ بھی کسی صنف میں لکھنے کی اپنی قابلیت جانچنا چاہتی تھیں۔

جب سخاوت واپس آئے، تو انہوں نے ویسا ہی کیا، جیسی رقیہ کو توقع تھی۔ انہوں نے یوں ہی سرسری طور پر پوچھا کہ وہ اتنے دن کیا کرتی رہیں۔ ''میں نے جب انہیں مسودہ دکھایا'' تو انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پورا پڑھ ڈالا۔ ''ایسا ظالم انتقام' انہوں نے کہانی ختم کر کے کہا۔ وہ کہانی سے متاثر ہوئے۔ اس میں ایسے اچنبھے کی بھی کوئی بات نہیں۔ اور اپنے دوست مسٹر میکفرسن، کمشنر بھاگلپور، کو یہ کہانی بھجوائی کہ وہ اس پر اپنی رائے دیں۔ کسی بھی نئے لکھنے والے کی طرح رقیہ کے لئے یہ بات بڑے اطمینان کی تھی کہ انہوں نے بھی کہانی کے متعلق توصیفی رائے دی تھی۔ میرے شوہر کے نام خط میں انہوں نے لکھا' ''جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے' وہ بے حد دل کش ہیں۔ اپنی نوعیت میں انوکھے، اور انتہائی درست انگریزی میں ان پر اظہار کیا گیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ ہم مستقبل میں کس طرح فضائی سفر کر سکیں گے۔ ان کے مشورے یہاں بالکل نئی اپچ لئے ہوئے ہیں۔'' ایسی رایوں کے مدنظر سخاوت نے کسی طرح رقیہ کو منا لیا کہ وہ اس کہانی کو The Indian Ladies Magazine میں چھپنے کے لئے بھیجیں۔ جس نے اسے ۱۹۰۵ء میں چھاپ دیا۔ ۱۹۰۸ء تک مصنف کی حیثیت سے رقیہ میں اتنا اعتماد آ گیا تھا کہ وہ ''سلطانہ کے خواب'' کو کتاب کی صورت میں چھاپنے کا سوچ سکیں۔ اسی سال ایس کے لاہری اور کمپنی نے کلکتہ سے اس کتاب کو شائع کیا۔

یہ بات بھی حیران کن نہیں ہونا چاہیے کہ ''سلطانہ کے خواب کے لئے'' اکثر لوگوں کا

ردعمل ایک شیریں خواب کا سا ہے اور وہ اسے جابر شوہروں کے خلاف ''ظالم انتقام'' نہیں سمجھتے، جیسا کہ رقیہ کے باشعور اور حساس شوہر کا خیال تھا۔ ایسے لوگ جنہیں شکر میں لپٹے ان تلخ حقائق کا ادراک تھا، انہوں نے بھی اس کو رقیہ کے مضامین میں غیر مخفی طنز کی نشتریت اور چھبتی ہوئی بذلہ سنجی کے بعد تسلیم کیا تھا۔ ابوالحسین جیسے نقادوں نے سوئفٹ کے گلیورز ٹریولز سے اس کی مماثلت تلاش کی۔ یہ کتاب خود رقیہ کو بے حد پسند تھی اور انہوں نے اپنے مضامین بھی اس کا کئی بار حوالہ دیا۔ عورتوں کی مملکت میں مردوں کا انتہا درجہ کی علیحدگی کا شکار کر دینا اس جبر اور کمزوری کے خلاف ردعمل تھا، جو ہمارے یہاں عورتوں کا مقدر ہے۔ شاید مسز آر۔ ایس حسین نے کمزور بنگالی عورتوں میں اعتماد پیدا کرنے کی خاطر ایسا کیا کہ عورتوں میں بھی مردوں کے مساوی یا ان سے زیادہ صلاحتیں اور قابلیت پیدا ہو سکے۔ شاید وہ خود کو اس قدر ترقی یافتہ کر سکیں، جہاں انہیں فطرت پر مکمل دسترس حاصل ہو جائے اور مردوں کی مدد کی ضرورت نہ رہے۔ وہ اپنے لئے ایک ایسی دنیا تخلیق کر سکیں، جہاں حسن، فراوانی اور خیر ہو۔ ''سلطانہ کا خواب'' اسی کی غمازی کرتا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ''سلطانہ کا خواب'' کے مرد قاری اپنے گھر کی عورتوں کو ادراک ذات کی تحریک دینے کی کوشش کریں گے۔''

یقیناً رقیہ کی زندگی کی مہم یہی تھی۔ مسلمان بنگالی عورتوں کو اپنی ذات کا شعور پیدا کرنے کے لئے محرک کرنا اور معاشرے کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ اس راہ میں رکاوٹیں نہ کھڑی کرے۔ ''سلطانہ کا خواب'' بہت سی کہانیوں میں سے ایسی کہانی ہے، جس سے رقیہ نے زندگی بھر معاشرے کے بنیادی رویوں کے خلاف غیر متناہی جہاد جاری رکھا۔ عورتوں کے حقوق کی علمبردار ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اپنے قلم کو انتہائی مہارت سے استعمال کیا۔ مخالفوں کی کمزوریوں پر گرفت کے لئے ان کا مشاہدہ بے خطا تھا۔ ان کی حس مزاح بھی خوب تھی اور اس سے ان کے دعوؤں کی تقویت ملتی تھی۔ ان کا اسلوب بے حد جاندار اور ظریفانہ ہے، لیکن ان کی تحریروں کا بنیادی مقصد لطف انگیزی نہیں تھا۔ (بنگلہ دیش کے اسکولوں کے بچے رقیہ کے آج بھی ممنون ہیں کہ اپنے

مردہم عصروں کی طرح انہوں نے روکھے پھیکے مضامین نہیں لکھے) ان کا اسلوب تو موجودہ نظام پر سنجیدہ سوال اٹھاتا ہے، جو بظاہر حقیقت معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق گمان پیدا کرتا ہے اور ان کے خیال میں جو کچھ شر اور بے انصافی ہے اس کے خلاف تبدیلی پر لوگوں کو آمادہ کرتا ہے۔

تبدیلی کی یہی مہم وہ وجہ ہوگی جس کی وجہ سے رقیہ نے انگریزی میں لکھنا اور شائع ہونا جاری نہیں رکھا۔ حالانکہ اپنی انگریزی تحریر کے متعلق انہیں اپنے ہم عصروں سے بہت تحسین ملی۔ ان کا قلم تو معاشرتی اصلاح کے لئے ایک ہتھیار تھا۔ ان کا بنیادی خیال تو یہ تھا کہ وہ اپنے طبقہ کے مسلم بنگال کے مرد اور عورتوں دونوں کے شعور کو بیدار کریں۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنی ہی زبان سب سے بہتر وسیلہ تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلوب اور طرز تحریر کے بارے میں بہت محتاط بھی تھیں۔ اور اپنے لفظوں سے، اپنا مقصد پوری طرح حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جن زبانوں سے وہ واقف تھیں، انگریزی اس میں پانچویں تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ احساس ہو کہ اپنی تخلیق وتصنیف کے لئے انگریزی محاورہ ان کے فطری جوہر سے میل نہیں کھاتا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، رقیہ نے کبھی اس پر اظہار خیال نہیں کیا، لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ انگریزی کو انہوں نے جب ہی استعمال کیا جب کوئی مجبوری آن پڑی۔

''سلطانہ کا خواب'' ایک افلاطونی تحریر ہے اور اس میں طنز ومزاح کی کاٹ خوب ہے۔ ہندوستانی پس منظر ہونے پر کوئی مغالطہ نہیں۔ مثال کے طور پر سسٹر سارہ اور سلطانہ کے مکالمہ میں ''تذکیر وتانیث'' کے ہندوستانی تصورات موجود ہیں۔ سلطانہ ہندوستانی معاشرے کی مخصوص نمائندہ ہے اور سسٹر سارہ باہر کی دنیا کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ مصنف کی ہم زاد بھی ہے۔ سلطانہ کے ذریعے سے رقیہ نے ہندوستانی رسوم ورواج کا مضحکہ اڑایا ہے۔

عورتوں کی مملکت میں، خواتین طاقت ور ہیں۔ رقیہ نے اس بات کو ضروری نہیں جانا کہ شدید تبدیلی کی خاطر، وہ مردوں کے وجود کو یکسر ہی مٹا ڈالیں۔ جس طرح شارلٹ پرکنز گل مین نے چند سال پہلے اپنی تصنیف ''ہرلینڈ'' میں کیا تھا۔ اور ایسے معاشرے کی تصویر پیش کی تھی جو

یک صنفی ہو۔عورتوں کی مملکت میں مرد معاشرے کا حصہ ہیں، لیکن جس طرح رقیہ کے ہندوستان میں عورتیں بے اختیار ہیں، اسی طرح وہاں مرد۔ وہ علیحدہ رہتے ہیں، امور خانہ داری اور بچوں کی نگہداشت ان کی ذمہ داری ہے، ویسے ہی جیسے رقیہ کے ہندوستان میں عورتوں کا کردار تھا۔عورتوں کی مملکت میں، خواتین سرکردہ ہیں، اور وہ مردوں کو کسی ہنر اور ڈھنگ کے قابل نہیں جانتیں، جیسے کہ اس وقت کے ہندوستانی مرد، عورتوں کے لئے خیال کرتے تھے۔ایسا لگتا ہے جیسے کہ صاحب اختیار مصنف مردوں کو مثالی دنیا میں سزا دے رہی ہیں۔ یہ ان تمام گناہوں کے خلاف ایک شاعرانہ انصاف ہے جو اصل دنیا میں عورتوں کے خلاف کئے گئے۔مردوں کو ان ہی کے رائج کردہ سکوں میں لوٹایا جا رہا ہے صرف تھوڑے سے منافع کے ساتھ۔رقیہ کی کہانی سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کیا عورتوں کی مملکت میں انسانوں کی خصلت بدل جاتی ہے۔شاید رقیہ کی منشاء بھی یہ نہ تھی۔ہاں جو بات ہمیں وثوق سے معلوم ہے وہ صرف اتنی ہے کہ پھر کبھی دوبارہ انہوں نے مردوں کو علیحدہ کرنے کی بات نہیں کی۔ رقیہ کے اندر آزادی اور انصاف کی جو لگن موجود تھی، اس کے پیش نظر یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ انہیں بھی کسی بھی صنف کا قبضہ وتصرف قابل قبول ہوتا۔

کہانی، خواب کے طور پر بیان کی گئی ہے، لیکن اس میں ایک منطقی تعلق موجود ہے۔ غیر معمولی چیزوں کا ہونا ممکن ہے۔مگر جادو یا مافوق الفطری طریقوں سے نہیں۔اس سب کو ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔ٹیکنالوجی انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہاں پھر ہندوستانی مزاج صاف نظر آتا ہے۔عورتوں کی مملکت میں وہ تمام سہولتیں ہیں جو رقیہ کی سرزمین میں نہیں۔ہمیں اس برصغیر کا تصور کرنا ہے جہاں گھوڑا گاڑیاں، گیس کی روشنی، دھویں اور بدبو سے اٹے باورچی خانے، دھول مٹی سے اٹی سڑکیں، قدرتی آفتیں، قحط، وبا...... لال بیگ، مچھر...... سب بڑے بڑے مسئلے اور چھوٹی چھوٹی الجھنیں روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہیں۔اس کہانی کے افلاطونی عنصر کی تحسین اور مصنف کا یہ اعتبار کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں، غور کے قابل باتیں ہیں۔ہم جو آج کل نیوکلیئر تباہی کی دھمکی تلے جیتے ہیں، انہیں

سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ فلاحی زاویہ، جس کا ذکر رقیہ اور گل مین جیسے مصنفین نے کیا ہے، ایک جذباتی اور سادہ لوحی کا زاویہ معلوم ہے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم سے پہلے کی دنیا میں یہ تصور اس طرح نظر نہ آتی ہوگی جس طرح ہماری آنکھ کے سامنے ہے۔

عورتوں کی مملکت میں رقیہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر جو اس قدر زور دیا ہے اسے اس بحث کے پس منظر میں بھی دیکھنا چاہیے جو اس وقت عورتوں کی تعلیم سے متعلق جاری تھی۔ ان کے ہم عصروں میں، ترقی پسند برہمو، جو خواتین کی تعلیم کے بڑے حمایتی تھے، وہ بھی سائنس اور حساب کو عورتوں کے تعلیمی نصاب کے لئے لازمی نہ جانتے تھے۔ اس حوالے سے رقیہ صرف عورتوں کی تعلیم کی سادہ سی بات نہیں کر رہی تھیں بلکہ ایسی تعلیم کی بات کر رہی تھیں جو عورتوں کو سائنس کے میدان میں برتری دلائے۔

آخر میں، کچھ اسلوب اور زبان کے بارے میں۔ رقیہ کا تصنیفی مزاج بنیادی طور پر ایک مضمون نگار کا تھا۔ رقیہ نے قصہ کہانی شاذ ہی لکھا اور انگریزی میں بھی شاذ۔ اور پھر بھی ''سلطانہ کا خواب'' ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ہم آج بھی اسے پڑھ کر مزہ لیتے ہیں۔ مغرب اور مشرق دونوں کے پڑھنے والوں کے لئے مردوں عورتوں کا یا کلپ، ایک سادہ، مزاحیہ اور مضبوط پلاٹ کے حوالے سے، آج بھی فکر انگیز ہے۔ اور خاص طور پر آج کے ماحول میں، جہاں عورتوں کا اختیار، اور صنفی کردار کی تعبیر نو، بین الاقوامی طور پر ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے، رقیہ کی کہانی اس سے کم افلاطونی معلوم ہوتی ہے جتنی وہ ۱۹۸۵ء میں معلوم ہوتی تھی۔

سلطانہ کا خواب

ایک شام میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز ہندوستانی عورتوں کے بارے میں یونہی سوچ رہی تھی۔ اب مجھے کچھ خیال نہیں شاید کہ ایسے میں میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے میں جاگ رہی تھی۔ مجھے چاندنی کی دودھیا روشنی میں چمکتا آسمان یاد ہے اور وہ ہزاروں ستارے بھی جو ہیروں کی طرح دمک رہے تھے۔

پلک جھپکنے میں ایک خاتون میرے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ وہاں اندر کیسے آ گئیں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے انہیں اپنی دوست سسٹر سارہ سمجھا۔

''صبح بخیر،'' سسٹر سارہ نے کہا۔ میں جی ہی جی میں ہنسی۔ بھلا صبح کہاں۔ اچھی بھلی تاروں بھری رات تھی۔ میں نے جواب دیا ''مزاج شریف؟''

''میں بخیر ہوں، شکریہ۔ چلو ذرا سا باہر چلو اور ہمارا باغ دیکھو۔'' میں نے کھڑکی سے پھر چاند کو دیکھا اور سوچا کہ اس وقت باہر جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ مرد ملازم تو اس وقت تک سو سلا گئے ہوں گیا ور ایسے میں سسٹر سارہ کے ساتھ خوش قدمی کر لینے میں کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔

جب ہم دارجیلنگ میں تھے میں اکثر سسٹر سارہ کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتی تھی۔ ہم اکثر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باغ میں خوش گپیاں کرتے سیر کیا کرتے۔ مجھے یہی گمان گزرا کہ شاید سسٹر سارہ مجھے کسی ایسے ہی باغ میں سیر کرانے کو لے جائیں گی۔ اسی لئے میں ان کی پیشکش پر چلنے کو

فوراً تیار ہوگئی۔

سیر کرنے میں میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ تو واقعی صبح کا بھلا سا سماں تھا۔ شہر جاگ چکا تھا اور سڑکوں پر کاروبار کا ہجوم اور غل تھا۔ میں بہت زیادہ جھینپ رہی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا برا حال تھا کہ بھرے دن میں، میں یوں سڑک پر نکل آئی تھی لیکن وہاں کہیں مرد کا نام ونشاں بھی نہ تھا۔

کچھ راہ گیروں نے میرا مذاق بھی اڑایا۔ ان کی زبان تو میری سمجھ میں نہ آئی، لیکن مجھے یہ احساس ہوگیا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ میں نے اپنی دوست سے پوچھا ''کیا کہہ رہی ہیں یہ؟''

''ان عورتوں کا خیال ہے کہ تم مردوں کی طرح ہو۔''

''مردوں کی طرح؟'' ''مطلب کیا ہے ان کا؟''

''ان کا خیال ہے کہ تم مردوں کی طرح شرمیلی اور ڈرپوک ہو۔''

''مردوں کی طرح شرمیلی اور ڈرپوک''۔ یہ اچھا مذاق ہے۔ میں بہت بدحواس ہوگئی جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ میری ساتھی سسٹر سارہ نہیں کوئی اجنبی ہے۔ میرے خدا، میں نے کیسی حماقت کی، ایک انجانی خاتون کو اپنی دوست سسٹر سارہ سمجھ بیٹھی۔

وہ میرا ہاتھ پکڑے چل رہی تھیں۔ انہوں نے بھی میری انگلیوں کی کپکپاہٹ محسوس کی۔ ''کیا ہوا، کیوں کیا ہوا؟'' انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

''مجھے یہ سب عجیب لگ رہا ہے۔'' میں نے معذرتانہ لہجے میں کہا: ''میں پردہ نشین ہوں، اور اس طرح بے تکلف، بے نقاب گھومنے پھرنے کی عادی نہیں۔''

''اس بات سے پریشان مت ہو کہ یہاں مردوں سے تمہاری ملاقات ہوسکتی ہے۔ یہ تو عورتوں کی راج دھانی ہے۔ گناہ اور نقصان سے محفوظ۔ خود نیکی یہاں راج کرتی ہے۔'' آہستہ آہستہ مجھے اردگرد کا لطف آنے لگا۔ واقعی یہاں سب کچھ شاندار تھا۔ میں تازہ شاداب گھاس کے

ایک قطعہ کو مخمل کا تکیہ سمجھ بیٹھی۔ یوں لگتا تھا کسی ملائم نرم قالین پر چلی جا رہی ہوں۔ میں نے جھک کر دیکھا تو سارا راستہ پھولوں اور سبزے سے اٹا پڑا تھا۔

''کیسا اچھا ہے سب کچھ؟'' میں نے کہا۔

''اچھا لگا نہیں؟'' سسٹر سارہ نے کہا: میں انہیں سسٹر سارہ کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہی اور وہ مجھے میرے نام سے۔

''جی بہت زیادہ۔ لیکن ایسے نازک پھولوں کو پیروں تلے مسل کر چلنا اچھا نہیں لگ رہا۔''

''سلطانہ، دل برا مت کرو اپنا۔ تمہارے چلنے سے یہ پھول خراب نہیں ہوں گے۔ یہ تو ایسے ہی خودرو ہیں۔''

''یہ جگہ ساری کی ساری باغ لگتی ہے۔'' میں نے تعریف کرتے ہوئے کہا: ''آپ نے ہر پودا اس سلیقے سے یہاں لگایا ہے۔''

''تمہارا کلکتہ اس سے بھی اچھا باغ ہو سکتا ہے۔ صرف اگر تمہارے ملک کے لوگ ایسا چاہیں تو۔''

''وہ باغ باغیچوں پر اتنی محنت کرنا بے کار سمجھیں گے۔ وہاں دوسرے اور کام اتنے ہیں کرنے کو۔''

''ان کے لئے یہ بہانہ اچھا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

میں یہ جاننے کو بے تاب تھی کہ آخر مرد کہاں ہیں؟ رستہ چلتے سینکڑوں عورتیں نظر آئیں مگر ایک بھی مرد دکھائی نہیں دیا۔

''مرد کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا

''جہاں انہیں ہونا چاہیے۔ اپنی موزوں جگہ پر۔''

''للہ مجھے بتلائیے موزوں جگہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟''

MashalBooks.org

''ارے، یہ تو غلطی ہوگئی مجھ سے۔تم یہاں کبھی آئی ہی نہیں، ہمارے رسم ورواج کی خبر تم کو کیونکر ہو؟ ہمارے مرد تو گھروں میں رہتے ہیں۔''

''جیسے ہم زنان خانے میں رہتے ہیں۔''

''بالکل ویسے ہی۔''

''کیسی عجیب بات ہے۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔سسٹر سارہ بھی ہنس پڑیں۔''لیکن، سلطانہ، میری عزیز، یہ کیسی بے انصافی ہے کہ ہم بے ضرر عورتیں تو گھروں میں بند رہیں اور مردیوں کھلے پھریں۔''

''کیوں؟ ہمارے لئے زنان خانے سے باہر آنا خطرے سے خالی نہیں۔آخر کو ہم کمزور ہیں۔''

''صحیح، ہمارے لئے باہر نکلنا اچھا نہیں، اگر باہر سڑکوں پر مرد ہوں یا کوئی جنگلی جانور بازار میں گھس آئے۔''

بالکل نہیں۔''

''فرض کرو کوئی دیوانہ پاگل خانے سے نکل کر مردوں کو، گھوڑوں کو اور دوسرے جانداروں کو آزار پہنچانا شروع کر دے تو ایسے میں تمہارے لوگ کیا کریں گے؟''

''انہیں پکڑ کر پھر سے بند کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''تمہارا بھلا ہو، تم لوگ بھی اس بات کو معقول نہیں سمجھتے کہ دیوانے کھلے پھریں اور صحیح الدماغ پاگل خانوں میں بند ہوں۔''

''قطعی نہیں''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرد جو آزار پہنچاتے ہیں یا آزار پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ تو آزار نہ گھومتے پھرتے ہیں اور عورتیں بے چاریاں زنان خانوں میں پابند ہیں۔ایسے بے قرینہ لوگوں کو کس طرح یوں آزادی دی جاسکتی ہے؟''

MashalBooks.org

''ہمیں اپنے سماجی معاملات میں کچھ کہنے سننے کا حق ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں تو مرد مالک اور آقا ہے۔ سارا اختیار اور فائدہ تو انہوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور عورتوں کو گھروں میں بند کیا ہے۔''

''تمہیں یہ بات قبول ہوگی کہ تمہیں پابند کر دیا جائے؟''

''مگر کچھ ہو بھی نہیں سکتا' آخر وہ عورتوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔''

''شیر انسان سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ انسانوں پر غلبہ حاصل کر لے۔ تمہاری ذات کا تم پر حق ہے اور تم لوگ اس کو بھلا بیٹھی ہو۔ اپنے بنیادی حقوق بھی تمہیں میسر نہیں کیونکہ تم نے اپنے نفع نقصان کا خیال ہی نہیں کیا۔''

''مگر سسٹر سارہ، اگر سب کچھ ہم خود ہی کرنے لگیں تو مرد آخر کیا کریں گے؟''

''انہیں کچھ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ مجھے معاف کر دینا وہ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ انہیں بھی پکڑ کر زنانے میں بند کر دو''۔

''یہ بات اتنی ہی آسان ہوگی کہ انہیں گھر کی چار دیواری میں پابند کر دیا جائے۔'' میں نے کہا: ''اور جو کہیں ایسا ہو گیا تو سارا معاملہ، کیا تجارت کیا سیاست، ان کے ساتھ زنانے میں قید ہو جائے گی۔''

سسٹر سارہ کچھ بولیں نہیں۔ بس ایک میٹھی سی مسکراہٹ مسکرا دیں۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ ایسے سے کیا بات کریں جو خود کنویں کے مینڈک سے کچھ بہتر نہیں۔

اتنے میں ہم سسٹر سارہ کے گھر پہنچ گئے۔ دل کی شکل کے خوبصورت سے باغیچہ میں یہ مکان تھا۔ اس بنگلہ کی چھت بل دار لوہے کی تھی۔ مگر ہمارے نفیس اور قیمتی مکانوں سے زیادہ بھلا اور خنک تھا۔ میں وہاں کی صفائی ستھرائی، سجاوٹ کے سلیقہ اور سامان کی خوبی کا بیان نہیں کر سکتی۔

ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ اندر سے کشیدہ کا کام اٹھا لائیں اور اس پر ایک نیا نمونہ کاڑھنا شروع کیا۔

MashalBooks.org

''تمہیں سلائی بنائی آتی ہے؟''

''جی، اور کچھ تو زنان خانہ والوں کو کشیدہ کا کام نہیں سونپتے''۔ وہ خوش دلی سے بولیں:
ایک مرد کو اتنا صبر کہاں کہ سوئی میں دھاگہ بھی پرو سکے''!

''یہ سب آپ نے خود بنایا ہے؟'' میں نے تپائیوں پر بچھے کڑھائی کے کام کو دیکھتے ہوئے کہا:

''جی''

''یہ سب کچھ کرنے کو آپ کو وقت کہاں سے مل جاتا ہے؟ آپ کو تو دفتر کا کام بھی سنبھالنا سات گھنٹے کام کرتے ہیں۔''

''دیکھا ہے میں نے انہیں کام کرتے۔ تمہارا خیال ہے وہ واقعی سات گھنٹے کام کرتے ہیں؟''

''قطعی، یقیناً''

''نہیں سلطانہ، میری عزیز، بالکل نہیں۔ وہ اپنا وقت سگریٹ پینے میں گزارتے ہیں۔ کچھ تو سارا دن، دو تین سگار پینے میں کاٹ دیتے ہیں۔ اپنے کام کا راگ زیادہ الاپتے ہیں، کرتے کم ہیں۔ فرض کرو کہ ایک سگریٹ پینے میں آدھا گھنٹا لگتا ہے۔ اور کوئی شخص دن بھر میں بارہ سگریٹ پھونک ڈالتا ہے۔ سو دن کے چھ گھنٹے تو صرف دھواں اڑانے میں غارت ہو گئے۔

ہم نے ادھر ادھر کی بہت باتیں کیں۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ نہ ان کے ہاں کوئی وبا پھوٹتی ہے، نہ مچھروں نے ان کی زندگی وبال جان کر رکھی ہے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ پتہ چلا کہ عورتوں کی اس مملکت میں، بس کوئی ایسا ویسا خطرناک حادثہ ہو تب ہی جوان مرگ ہوتی ہے۔

''ہمارا باورچی خانہ دیکھو گی؟''

''بڑی خوشی سے۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرے جانے کی

اطلاع پر مردوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ باورچی خانے کے اردگرد ترکاریوں کی ہری بھری کیاریاں تھیں۔ ایک ایک بیل، ایک ایک ٹماٹر تک اپنی جگہ سجاوٹ کی چیز تھا۔ مجھے کہیں دھوئیں کا نام نشان تک نظر نہ آیا۔ چمنی تک تو تھی نہیں۔ صاف ستھرا چمکدار۔ کھڑکیوں میں پھول سجے تھے۔ آگ، کوئلے کا کہیں نام نشان نہ تھا۔

''کھانا پکاتے کیسے ہیں آپ لوگ؟''

''سورج کی گرمی سے'' انہوں نے جواب دیا۔ اور ساتھ ساتھ وہ پائپ بھی دکھایا جس سے سورج کی روشنی اور گرمی اکٹھی کر لی جاتی تھی۔ اور اسی وقت انہوں نے مجھے جھٹ پٹ کچھ پکوان پکا کر دکھایا۔

''یہ آپ نے سورج کی حرارت کیسے اکٹھا کر لی؟'' میرا مارے حیرت کے برا حال تھا۔

''اچھا، تو پہلے ہم اپنی ذرا سی تاریخ بتائیں۔'' تیس برس پہلے جب ہماری ملکہ صرف تیرہ برس کی تھیں، تو وہ تاج کی وارث ٹھہریں۔ وہ صرف نام کی ملکہ تھیں۔ حکومت دراصل وزیر اعظم کے قبضہ اختیار میں تھی۔''

''ہماری ملکہ کو سائنس سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے حکم جاری کیا کہ ان کی سلطنت کی ہر عورت کو تعلیم دی جائے۔ لڑکیوں کے اسکول حکومت کی سرپرستی میں فوراً قائم کئے گئے۔ دور نزدیک سب عورتوں میں تعلیم عام کر دی گئی۔ کم سنی کی شادیوں پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ اکیس برس کی عمر سے پہلے کسی عورت کو شادی کرنے کی اجازت نہ تھی اور میں تمہیں بتاؤں کہ اس سارے انقلاب سے پہلے ہمیں بھی پردے میں رکھا جاتا تھا۔''

''وقت کیسے بدلتا ہے؟'' میں نے ہنس کر لقمہ دیا۔

''مگر مرد عورت کی علیحدگی اسی طرح ہے وہ بولیں، ''چند ہی سالوں میں ایسی یونیورسٹیاں وجود میں آئیں جہاں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

''دارالخلافہ میں جہاں، ملکہ رہتی ہیں۔ دو یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں سے ایک نے

عجیب وغریب غبارہ ایجاد کیا۔اس میں ڈھیروں پائپ لگا دیئے گئے اوراس طرح غبارہ فضا میں معلق کردیا گیا۔جس قدر پانی کی ضرورت پڑتی اتنا پانی یہ بادلوں سے کھینچ لیتا۔یونیورسٹی والے سارا وقت تو پانی کھینچا کرتے۔تو بادل گھر کر نہیں آپاتے تھے۔اس طرح اس ذہین پرنسپل نے بارش اور طوفان کا سد باب کر لیا۔''

''سچ مچ۔اچھا تو یہاں کیچڑ اسی لئے کہیں نظر نہیں آتی۔'' میں نے کہا،لیکن یہ بات میرے پلے نہ پڑی تھی کہ پائپوں میں پانی کس طرح جمع کیا جاسکتا تھا۔انہوں نے میرے لئے اس عمل کی وضاحت کی۔لیکن میں پھر بھی نہ سمجھ پائی۔سائنس کے بارے میں میرا علم بڑا محدود اور ناقص تھا،لیکن انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''دوسری یونیورسٹی کو جب اس بات کی خبر ملی تو انہیں بہت رشک آیا اور انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر کوئی نئی بات پیدا کرنے کی کاوش کی۔انہوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کر لیا،جس سے ضرورت کے مطابق سورج کی حرارت کو مجتمع کیا جاسکتا تھا۔اور وہ حرارت اس طرح جمع کرکے رکھی جاسکتی تھی کہ دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تقسیم کی جاسکے۔

''عورتیں جس وقت سائنسی تحقیق میں مصروف تھیں،اس ملک کے مرد اپنی فوجی قوت بڑھانے میں مصروف تھے۔انہیں جب اس کیا طلاع ملی کہ عورتوں کی ایک یونیورسٹی نے فضا سے پانی جمع کر لیا اور دوسری نے سورج کی حرارت۔تو انہوں نے یونیورسٹی والوں کا مذاق اڑایا اور اسے عورتوں کا جذباتی خواب کہہ کر بات ٹھٹے میں اڑا دی۔''

''آپ نے تو کمال کر دیا مگر یہ بتایئے کہ آپ نے اپنے ملک کے مردوں کو زنانہ میں کس طرح پابند کیا۔کیا پہلے انہیں گرفتار کیا تھا؟''

''نہی تو''

''لیکن یہ ہونا بھی تو ممکن نہیں،کہ وہ برضاء ورغبت اپنی آزار اور بے غل وغش زندگی کو خیر باد کہہ دیں اور چار دیواری کی پابندی کو قبول کرلیں آخر انہیں کسی طرح تو قابو میں کیا گیا ہوگا۔''

''ہاں، ان پر قابو تو پایا گیا۔''

''مگر کس نے؟ جنگجو خواتین نے۔ میرے خیال میں؟''

''نہیں، طاقت اور اسلحہ کے زور پر نہیں۔''

صحیح، یوں ہو بھی نہیں سکتا۔ مرد عورتوں سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں، مگر؟''

''دماغ سے۔''

''لیکن مردوں کے تو دماغ بھی عورتوں سے زیادہ بڑے اور وزنی ہوتے ہیں۔ نہیں ہوتے کیا؟''

''ہاں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھی کا دماغ انسان کے دماغ سے کہیں بڑا ہوتا ہے، لیکن انسان ہاتھی کو زنجیر کر لیتا ہے اور اپنی مرضی سے انہیں کام میں لاتا ہے۔''

''بہت خوب۔ لیکن یہ تو بتایئے یہ سب ہوا کیسے؟ میں تو جاننے کو مری جا رہی ہوں۔''

''مردوں کے دماغ سے عورتوں کے دماغ تیز ہوتے ہیں۔ دس برس پہلے جب ہمارے فوجی افسروں نے ہماری سائنسی دریافت کو مجذوب کی بڑ ٹھہرایا تھا تو ہماری کچھ نوجوان ساتھیوں نے ان کی اس بات کا جواب دینے کی ٹھانی تھی، لیکن دونوں پرنسپل خواتین نے انہیں ایسا کرنے سے یہ سمجھا کر روک دیا تھا کہ جب انہیں موقعہ ملے تو جواب لفظوں کی بجائے عمل سے دینا بہتر ہوگا اور انہیں اس موقعہ کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔''

''واہ، واہ مزہ آ گیا۔'' میں نے بہت جی سے تالی بجائی۔

''اور اب وہ غرور ناز والے حضرات خود جذباتی خواب دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد ہی ایک پڑوسی ملک کے کچھ لوگوں نے ہمارے یہاں پناہ لی۔ بڑی آفت میں تھے وہ، کچھ سیاسی خرابی ہوگئی تھی ان سے۔ ان کا بادشاہ، اچھے انتظام سے زیادہ طاقت کا رسیا تھا۔ ہماری مہربان ملکہ سے اس نے یہ افسر واپس مانگے، تو ہماری ملکہ نے صاف جواب دے دیا۔ پناہ لینے والے کو دربدر کرنا ان کے اصول کے خلاف ہے۔ بادشاہ کو اس انکار کی تاب نہ تھی۔ اس نے ہمارے ملک کے

خلاف اعلان جنگ کر دیا۔''

''ہمارے سپاہی بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور دشمن کو پسپا کرنے کو نکل پڑے۔ دشمن بہت طاقتور تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سپاہی بڑی جی داری سے لڑے، لیکن ان کی ساری بہادری کے باوجود دشمن کی فوج کی پیش قدمی جاری رہی۔''

''تقریباً سب ہی مرد جنگ میں شریک تھے۔ سوا برس تک کا لڑکا تو گھر میں ٹھہرا نہیں، ہمارے ڈھیروں سپاہی مارے گئے، باقی پسپا ہوئے اور دشمن ہماری سرحد سے بس پچیس میل دور رہ گیا۔''

دانا اور ہوش مند عورتوں سے ملکہ نے مشورہ کیا کہ ''اب کیا کرنا چاہیے کہ اپنی سرزمین کی حفاظت کی جا سکے؟''

کچھ نے صلاح دی کہ ''عورتیں بھی جنگ میں شریک ہوں۔'' کچھ نے اعتراض کیا کہ ''عورتیں تلوار بندوق سے لڑنے کی اہل نہیں ہیں اور نہ انہیں اسلحہ استعمال کرنا آتا ہے۔'' ایک تیسرے گروہ نے کہا کہ ''عورتیں جسمانی طور پر بہت کمزور ہیں۔''

''اگر آپ اپنے ملک کو جسمانی طاقت سے نہیں بچا سکتیں تو پھر عقل و تدبر سے کام کیجئے۔'' ملکہ نے تجویز کیا۔

کچھ دیر تک تو بالکل سناٹا رہا، ملکہ عالیہ نے پھر کہا: ''اگر میرے ملک اور میری عزت پر آنچ آئی تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔''

سورج کی حرارت جمع کرنے والی یونیورسٹی کی خاتون پرنسپل جو اس سارے وقت خاموش بیٹھی رہی تھیں، بولیں، ''ہم سب سمجھ نہیں پا رہی ہیں اور بظاہر بچنے کی امید بھی کم نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک ترکیب ہے جسے آزمایا جا سکتا ہے۔''

یہ ان کی پہلی اور آخری کوشش ہوگی اور اگر وہ ناکام ہو گئیں تو جان دینے کے سوا کوئی اور راستہ نہ ہوگا۔ جو بھی وہاں موجود تھیں انہوں نے پکا عہد کیا کہ ''وہ خود کو کسی قیمت پر بھی غلام نہیں

ہونے دیں گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

ملکہ نے سب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور خاتون پرنسپل سے کہا کہ وہ اپنی تجویز پر عمل کریں۔ خاتون پرنسپل کھڑی ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ ''ہمارے باہر جانے سے پہلے سب مرد زنانے میں چلے جائیں، میں پردے کی خاطر یہ التجا کر رہی ہوں۔''

''ہاں، کیوں نہیں'' ملکہ عالیہ نے جواب دیا۔

دوسرے دن ملکہ نے سب مردوں کو حکم دیا کہ عزت اور آزادی کی خاطر وہ سب زنانے میں چلے جائیں۔

زخمی اور تھکے تو وہ تھے ہی، انہیں یہ حکم ایک نعمت معلوم ہوا۔ احتجاج کا ایک حرف کہے بغیر انہوں نے ملکہ کو تعظیم دی اور زنانے میں چلے گئے۔ ان کو پکا یقین تھا کہ ملک کے بچ جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

پھر خاتون پرنسپل، اپنی دو ہزار شاگردوں کو ساتھ لے کر میدان جنگ کو چلیں، وہاں پہنچتے ہی جمع کی ہوئی سورج کی حرارت کا رخ دشمن کی طرف موڑ دیا۔ گرمی اور روشنی ان کی برداشت سے باہر تھی۔ خوف کے مارے انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی۔ اپنی بدحواسی میں انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس تپش کا توڑ کیونکر ڈھونڈیں۔ وہ اپنا اسلحہ اور سامان جنگ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہ سب بھی سورج کی گرمی نے بھسم کر ڈالا۔

''وہ دن اور آج کا دن کسی نے ہمارے ملک کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کی اور اس دن سے آپ کے مردوں نے زنانہ سے باہر آنے کی کوشش بھی نہیں کی۔''

''ہاں، وہ آزاد ہونا چاہتے تھے۔'' کچھ پولیس کمشنروں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے ملکہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ ''فوج کے افسروں کو ان کی نااہلی پر قید کی سزا ہونا چاہیے۔'' لیکن انہوں نے خود اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی اور اس لئے انہیں سزا نہ دی جائے۔ یہ التجا بھی کی کہ ''ان کو، ان کے عہدوں پر بحال کر دیا جائے۔''

ملکہ عالیہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ ''اگر ان کی خدمات کی ضرورت ہوئی تو انہیں اطلاع دے دی جائے گی ورنہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔''

اب انہیں پردے کی عادت ہوگئی ہے اور چار دیواری میں رہنے کی انہیں اب شکایت بھی نہیں۔ ہم اسے اب زنانہ کی بجائے مردانہ کہتے ہیں۔

''لیکن آخر آپ لوگ معاملات سے کس طرح نبٹتے ہیں۔'' میں نے سسٹر سارہ سے پوچھا:

''چوری، قتل، کچھ ہوجائے تو پولیس اور مجسٹریٹ کے بغیر کیسے کام چلے۔''

جب سے یہ مردانہ سسٹم شروع ہوا ہے، جرائم ہی نہیں ہوتے۔ سو ہمیں پولیس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ مجرم کو پکڑے نہ ہمیں مجسٹریٹ کی ضرورت ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کرے۔''

''یہ تو واقعی بہت اچھی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کہیں بے ایمان لوگ ہوں، تو آپ ان کیا اچھی طرح سرزنش کرسکیں گے۔'' ایک بوند خون بہائے بغیر، اگر آپ دشمن پر فتح حاصل کرسکتی ہیں تو جرم اور مجرم دونوں کا خاتمہ آپ کے لئے کون سی مشکل بات ہے۔''

''اچھا، سلطانہ، تم یہاں بیٹھو گی یا میرے کمرے میں چلو گی۔'' انہوں نے مجھ سے پوچھا: ''آپ کا باورچی خانہ کسی ملکہ کی خلوت گاہ سے کم ہے کیا!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''لیکن ہمیں اب چلنا چاہیے مرد حضرات اب مجھے کوس رہے ہوں گے کہ میں نے ان کے کام میں اتنا ہرج کیا۔'' ہم دونوں زور سے ہنس پڑیں۔

میرے دوستوں عزیزوں کو یہ سن کر کتنا مزہ آئے گا، جب میں واپس جا کر انہیں یہ بتاؤں گی کہ ''دور عورتوں کے دیس میں عورتیں حکومت کرتی ہیں اور تمام امور چلاتی ہیں جبکہ مرد مردانے میں رہتے ہیں، بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور گھر کے سارے کام کرتے ہیں، کھانا پکاتے ہیں اور کھانا پکانا کس قدر آسان ہے۔'' سچ مچ اس طرح کھانا پکانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

''جو کچھ تم یہاں دیکھو، اس کا حال انہیں ضرور بتانا۔''

مجھے مہربانی کر کے یہ بھی بتایئے کہ آپ کھیتی باڑی کیسے کرتی ہیں، ہل چلانے کا کیا ہوتا ہے اور دوسرے مشقت کے کام کس طرح ہوتے ہیں۔''

''ہمارے کھیتوں میں کام بجلی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اسی سے دوسرے کام بھی ہو جاتے ہیں اور ہماری ہوائی سواریاں بھی اسی سے چلتی ہیں۔ ہمارے یہاں نہ تو ریل ہے نہ پکی سڑکیں، اس لئے یہاں ریل کے یا سڑک حادثے نہیں ہوتے''۔ میں نے کہا: ''آپ کے یہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بارشیں نہ ہوں اور سوکھا پڑ جائے۔'' میں پوچھا:

''نہیں جب سے پانی کا غبارہ لگا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا۔'' وہ اس بڑے غبارے سے لگے پائپ دیکھ رہی ہو، ان سے ہمیں جتنا پانی بارش کے لئے چاہیے ہوتا ہے لے لیتا ہیں۔ ہمیں طوفان کا خطرہ ہے نہ سیلاب کا۔ ہماری کوششیں یہ ہے کہ قدرت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھالیں۔ ہم فارغ نہیں بیٹھتیں اس لئے لڑنے جھگڑنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ ہماری ملکہ کو ہریالی پھلواری بہت پسند ہے۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ سارے ملک کو ایک خوبصورت باغ بناڈالیں۔''

خیال زبردست ہے، آپ لوگ زیادہ تر کیا کھاتے ہیں'

''پھل''

گرمی کے موسم میں آپ ٹھنڈک کا کیا انتظام کرتی ہیں؟ ''ہمارے لئے تو گرمیوں میں بارش نعمت ہوتی ہے۔''

جب گرمی برداشت نہیں ہوتی تو ہم مصنوعی فواروں سے مینہ برسا لیتے ہیں۔ سردیوں میں سورج کی جمع کی ہوئی حرارت سے مکان گرم کر لیتے ہیں۔

پھر انہوں نے مجھے اپنا غسل خانہ دکھایا۔ اس کی چھت ہٹائی جا سکتی تھی چھت ہٹا کر جب جی چاہے وہ مزے میں غسل کر سکتی تھیں۔ چھت کیا تھی ایک صندوق کا ڈھکنا سا تھا، چھت ہٹائی اور نہانے کو نل کھول لیا۔ ''آپ لوگ بہت خوش نصیب ہیں۔'' میں نے بے ساختہ کہا، ''آپ

کو کسی چیز کی کمی نہیں۔'' آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ اگر میں پوچھ سکوں تو؟''

''ہمارا عقیدہ محبت اور سچائی ہے۔ یہ ہماری مذہبی ذمہ داری ہے کہ ایک دوسرے سے محبت کریں اور نیک نیتی سے ایک دوسرے کے ساتھ سچے ہوں، اگر کوئی بھی شخص جھوٹ بولتا ہے مرد ہو یا عورت......''

اسے سزائے موت ملتی ہے؟

''نہیں، نہیں، موت نہیں، ہمیں خدا کی مخلوق کی جان لینے میں مزہ نہیں آتا، خاص طور پر انسان کی۔ جھوٹے سے کہا جاتا ہے کہ وہ یہ سرزمین چھوڑ کر چلا جائے اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔''

''کبھی کسی مجرم کو معاف بھی کیا گیا؟''

''بالکل، اگر وہ سچے دل سے توبہ کر لے۔''

''آپ کو کسی اور مرد سے ملنے کی اجازت نہیں ہے، سوائے اپنے رشتہ داروں کے؟

''محرم کے سوا کسی اور سے نہیں۔''

''ہمارے محرم تو بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں۔ سگے خالہ زاد، چچا زاد تک محرم نہیں۔''

''مگر ہمارا دائرہ بہت بڑا ہے، دور پار کے رشتہ کا بھائی بھی سگے بھائیوں کی طرح ہوتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ کی سرزمین پر پاکیزگی کا اختیار ہے۔ میں آپ کی ایسی اچھی ملکہ سے بھی ملنا چاہتی ہوں جن کی دور بینی اور حوصلے کا جواب نہیں، جنہوں نے یہ سب قوانین بنائے۔''

''اچھا'' سسٹر سارہ نے کہا۔

پھر انہوں نے ایک چوکور تختے پر دو چار کرسیاں پیچوں سے کسیں۔ اسی تختے سے انہوں نے دو چکنے خوب پالش کئے ہوئے گولے بھی باندھے۔ جب میں نے پوچھا کہ ''یہ گولے کس لئے

ہیں'' تو انہوں نے بتایا کہ ''یہ ہائیڈروجن کے گولے ہیں اور کشش ثقل سے سدباب کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ گولے مختلف حیثیت کے تھے تاکہ وزن میں جس قدر کمی بیشی کرنا مقصود ہو تو انہیں استعمال کیا جا سکے۔ پھر انہوں نے اس ہوائی کار سے پروں کی طرح کے دو پنکھے باندھے جو انہوں نے بتایا کہ بجلی سے چلتے ہیں جب ہم آرام سے بیٹھ گئے تو انہوں نے ایک گھنڈی کو چھوا اور پنکھے گھومنا شروع ہوئے اور پھر ہر لحہ تیز سے تیز تر ہو گئے۔ پہلے تو ہم چھ سات فٹ اوپر اٹھے اور بس پھر ہم اڑ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ مجھے یہ خبر ہوتی کہ ہمارا سفر شروع ہوا ہے، ہم ملکہ کے باغ تک پہنچ چکے تھے۔

میری دوست نے مشین کا عمل الٹا گھما کر ہوائی کار کو نیچے کیا اور جب کار زمین سے لگی تو مشین بند ہو چکی تھی اور ہم نیچے اتر آئے۔

میں نے ہوائی کار کے نیچے اترنے سے پہلے ملکہ کو باغ کی روش پر سیر کرتے دیکھ لیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی چار سالہ بیٹی تھی اور ان کی خواص۔

''آہا، سو تم آ گئیں'' ملکہ نے سسٹر سارہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ملکہ عالیہ سے میرا تعارف کرایا گیا اور وہ مجھ سے بغیر کسی رسم کسی تکلف کے ملیں۔

مجھے ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں ملکہ نے مجھے بتلایا کہ انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ان کی رعایا تجارت کرے۔ ''لیکن'' انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''ان ملکوں سے یہ ممکن نہیں ہے جہاں عورتوں کو زنانے میں پابند رکھا جاتا ہے۔ ہمارے تجربے میں مرد اخلاق میں کچھ اچھے نہیں اور ہمیں ان سے معاملت کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ہم دوسروں کی سرزمین پر نظر نہیں رکھتے نہ ہمیں ہیروں کے ٹکڑوں کی خاطر جنگ منظور، چاہے وہ ہیرا کوہ نور سے ہزار درجہ زیادہ قیمتی کیوں نہ ہو۔ نہ ہمیں کسی کے تخت طاؤس سے کوئی غرض۔ ہم تو علم کے سمندر کے شناور ہیں اور وہاں سے وہ جواہر ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جو قدرت نے ہمارے لئے عطا کئے ہیں۔ قدرت کے ان

MashalBooks.org

عطیوں سے ہم زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔'' ملکہ سے رخصت لے کر میں ان کی نامی یونیورسٹیوں میں گئی اور انہوں نے مجھے اپنے کارخانے، لیبارٹریاں اور معائنہ گاہیں دکھائیں۔

ان عمدہ جگہوں کو دیکھ کر ہم پھر ہوائی کار میں بیٹھے۔ ابھی وہ چلنا شروع ہی ہوئی تھی کہ میں گر پڑی۔ میری آنکھ کھل گئی اور خواب ہوا ہو گیا۔ میں اپنی خوابگاہ میں آرام کرسی پر دراز تھی!

MashalBooks.org

روشن جہاں

ایک واضح خواب کی طرح مجھے ''عزلت نشین'' سے اپنا تعارف یاد ہے۔ میں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ کھیل رہی تھی اور میری اماں خالہ کو یہ پڑھ کر سنا رہی تھیں، وہ دونوں کتاب میں بالکل محو تھیں۔ میں نے اپنے کان ادھر لگا دیے۔ ایک عورت کا قصہ تھا جو برقعہ اوڑھتی تھی۔ میں نے اس لباس کا نام تک نہ سنا تھا۔ وہ بیچاری عورت ریل کی پٹڑی پر گر پڑی تھی۔ بے یقینی اور خوف کے عالم میں مجھے یہ پتہ چلا کہ اس کی خادمہ نے کسی کو مدد کے لئے اس کے پاس نہ پھٹکنے دیا اور آخر کار ایک ریل گاڑی نے اسے کچل ڈالا۔ میرا معصوم ذہن تو ان باتوں سے مانوس تھا کہ کہیں سے بالکل آخری گھڑی میں کوئی ہیرو آ جاتا اور اس کی شجاعت سے آفت ٹل جاتی۔ میرے لئے اس قدر رنجیدہ انجام بالکل نا قابل قبول تھا۔ احمق خادمہ نے کس طرح اس بے چاری عورت کا مرجانا قبول کیا؟ اور وہ سارے عقل سے فارغ لوگ اسے پٹڑی سے ہٹانے کے لئے کچھ کیوں نہ کر سکے؟ اپنا غصہ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں پھٹ پڑی۔ میری ماں گھبرا گئیں اور انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ میری بہن نے جب توجہ اپنی طرف نہ پائی تو رونا شروع کر دیا۔ اس سارے شور شرابے میں میرے سارے سوال دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بچوں کا ذہن بہت جلدی اپنے لئے کچھ اور تلاش کر لیتا ہے۔ یہ بھیانک کہانی بھی معصوم مصروفیتوں میں کہیں ادھر ادھر ہو گئیں۔ بظاہر جیسے بھلا دی گئی۔

برسوں بعد، جب میں نے یہ کہانی دوبارہ پڑھی، خوف اور غصہ اسی طرح مجھ پر غالب

آ گیا مگر اس دفعہ اس میں ترس بھی شامل تھا۔ اب میں بچہ نہ رہی تھی۔ میں نے خود تو کبھی برقعہ نہ اوڑھنا تھا لیکن دوسروں کو اوڑھے دیکھا تھا۔ اب مجھے پردے کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا۔ پردہ کرنے کے مختلف طریقے، پردے کی ضرورت، قصہ مختصر وہ سب باتیں جو بنگلہ دیش (اس وقت مشرقی پاکستان) میں پلنے پڑھنے والی ایک نوجوان لڑکی کو معلوم ہونا چاہیے تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ پردے کی شدید پابندیوں کا جس طرح رقیہ اوران کی ہم عصروں نے تجربہ کیا، اسے میرے جیسے ہی تصور کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے درمیان وقت کا فاصلہ موجود ہے۔ جن احساسات کے زیر اثر وہ اپنے ان تجربات کے متعلق لکھنے پر مجبور ہوئیں، ان کا آج کے پڑھنے والوں پر شدید تاثر چھوڑنا لازمی بات ہے۔ ہم رقیہ کے شکر گزار ہیں کہ باوجود اس کے کہ انہوں نے پردے کو ایسا قاتل کہا جو کاربن مونو آکسائڈ کی طرح خاموش قاتل ہیں۔ لیکن انہوں نے پردے کی پابندی میں خاموشی سے تباہ ہونا قبول نہیں کیا۔ ڈائی لین تھامس نے اپنے قریب المرگ والدین کے لئے کہا تھا ''روشنی کے بجھنے پر غصہ کرنا چاہیے۔'' رقیہ نے بھی اپنی ساتھیوں کے غضب کو للکارا تھا کہ وہ اندھیرے سے باہر نکلیں۔

(بنگالی میں اوارودھ باسنی) سب سے پہلے ۱۹۲۹ء میں ایک مشہور بنگالی رسالے ''ماہانہ محمدی'' میں قسط وار چھپتی رہی۔ یہ سینتالیس واقعات تھے جن میں شمالی ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے پردے کے رسم ورواج کو موضوع بنایا گیا تھا۔ بعد میں ان قسطوں کا مجموعہ کتاب کی شکل میں بھی چھپا۔ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے کسی مسلمان بنگالی خاتون کے قلم سے بنگالی زبان میں لکھی گئی پہلی کتاب تھی۔ اس سے پہلے کچھ کتابیں ہندوستانی عورتوں کی زنان خانہ کی زندگی کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔ بنگالی ہندو خواتین کی ابھی حال کی لکھی ہوئی کتابوں میں عورتوں کی زندگی کی گھٹن موضوع ہے مگر ان میں سے زیادہ سوانح عمریوں کی طرح کی ہیں جیسے روزنامچے، ڈائریاں، خط، یادداشتیں، ان کا اسلوب بھی انتہائی شخصی اور ذاتی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱۔۱۸۶۱) اور شرت چندر چٹر جی (۱۹۳۸۔۱۸۶۷) نے زنان خانے کی زندگی کے متعلق اپنے افسانوں اور

ناولوں میں لکھا۔ ان کی تحریروں میں احساس کی گیرائی، مشاہدہ کی گہرائی اورعورتوں سے ہمدردی پائی جاتی ہے۔لیکن یہ مرکزی موضوع نہیں ہے۔ یہ ذکر بکھرا ہوا ہے اور پلاٹ میں کہیں حادثاتی طور پر درآیا ہے۔ رقیہ کی کتاب ''عزلت نشین'' اپنی ذات میں غیرافسانوی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ شمالی ہند اور بالخصوص بنگال کی عورتوں پر پردے کی جوشدید پابندیاں لگائی گئی ،ان کے بے معنی اور مضحکہ خیز ہونے کا احساددلایا جائے۔

''عزلت نشین'' سے لئے گئے واقعات جنہیں یہاں دہرایا گیا ہے، پردے کی سختیوں کا اظہار ہیں۔کبھی کرب اور کبھی مزاح کے اسلوب میں۔ یہ واقعات صرف پردے کے مروجہ طور طریقوں سے بحث نہیں کرتے بلکہ پردہ نشین گھرانوں کی عورتوں اور مردوں کے رویوں کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ غیر پردہ نشینوں کے ان رویوں کا بھی اظہار ہے جو پردہ نشینوں سے متعلق ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود رقیہ کا اپنا رویہ اس پوری کتاب پر حاوی ہے۔ رقیہ نے کہیں بھی غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔انہوں نے صرف ان واقعات کا انتخاب کیا جنہوں نے پردہ نشینی کے مضحکہ خیز، بے ہودہ، ہولناک اور دکھی کرنے والے پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ ان تحریروں کے تاریخی پس منظر کو کبھی ذہن سے محو نہ ہونے دیا جائے۔ یہ تحریریں آج کے معاشرے کے غمازی نہیں کرتیں۔

یہ بات کہ پردہ اور عزت ومنزلت کا آپس میں بڑا قریبی رشتہ ہے اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ پردہ نشین گھرانوں کی خادماؤں کو اپنی مالکنوں سے زیادہ چلنے پھرنے اور نظر آنے کی آزادی میسر تھی۔ پردے کے اصول لچکدار تھے اور عمائدین کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالے جاسکتے تھے۔ان اونچے گھرانوں میں پردے کی پابندی کا خیال دوسرے طبقہ کی بے پردہ خواتین کے تناظر میں تھا اور یہ بات بھی ان ہندو اور مسلمان اونچے درجے کے لوگوں کو اختلافی اور متضاد نہیں معلوم ہوتی تھی۔اس تضاد کی اہمیت رقیہ کی نظر سے بھی اوجھل رہی۔اس معاملے میں وہ اپنے طبقے اور اپنے زمانے کی پروردہ ہیں۔

MashalBooks.org

''عزلت نشین'' کی اصل قدر وقیمت یہ ہے کہ سب باتوں کے باوجود تمام عورتوں نے پردے کی اس سختی کو برضا ورغبت قبول نہیں کیا تھا۔ بہت سی خواتین نے اس کا مقابلہ کیا اور اپنی انفرادیت کا احساس دلایا۔ انہیں اس بات پر بھی غم وغصہ تھا کہ انہیں اپنی تقدیر اور زندگی پر خود کوئی اختیار حاصل نہیں۔ رقیہ نے جس شدومد سے پردے کی پابندی کو رد کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پردے کی آڑ میں عورتوں کو پابند کرنے کی شدید کوشش ان کی ترقی اور تکمیل ذات کے عمل پر پانی نہیں پھیر سکی۔

اس بات کے اظہار میں ہی ''عزلت نشین'' ہندوستانی معاشرے میں زنان خانے کی تصویر کشی کے موضوع سے متعلق دوسری تحریروں سے مختلف ہے۔ خاص طور پر وہ تحریریں جو غیر ملکی خواتین، بالخصوص انگریز اور امریکی مصنفین نے لکھیں۔ یہ خواتین ہندوستان میں اواخر انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی میں آئی تھیں۔ کچھ غیر ملکی خواتین جیسے میری فرانسس بلنگٹن نے انتہائی دیانت داری سے موضوع کا حق نبھایا، لیکن ان کا مشاہدہ ایک فاصلے سے تھا۔ ان کے تاثرات مختصر اور سرسری تھے۔ ایک انگریز خاتون بیگم میر حسن علی، ایک ہندوستانی مسلمان کی بیوی ہونے کے باوجود پردے کی پابند خواتین کی زندگی کا دکھ نہیں سمجھ پائیں۔ برسوں ایک ہندوستانی خاندان کے فرد کی حیثیت سے انہوں نے زندگی بتائی اور زنان خانوں میں بھی ان کا آنا جانا رہا۔ پھر بھی انہوں نے یہ جانا کہ ہندوستانی خواتین پردے کی پابندی پر شاکر ہیں۔ رقیہ کی تحریریں ان تحریروں کی طرح سرسری نہیں بلکہ مشاہدے اور احساس کی قوت سے بھرپور ہیں۔ کیتھرین میو کا پردے کے خلاف احتجاج، رقیہ کی طرح پرزور تو تھا لیکن پھر بھی محدود تھا۔ ان کے تعصّبات شدید تھے۔ انگریزوں کے حق میں ہندوستانیوں کے خلاف ان کا سیاسی نظریہ ان کی تحریر پر غالب تھا۔

رقیہ کو دوسری طرف اسی ثقافت اور تہذیب کا نمائندہ ہونے کا فائدہ حاصل تھا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم وروابط کے حوالے سے مغربی تہذیب وثقافت سے ان کی آشنائی نے ان کی فکر کو یہ معروضیت بخشی کہ وہ اپنی ذات سے الگ کر کے، خاص طور پر مسلمان پردہ نشین خواتین کے

معاملات کوایک اورزاویہ سے دیکھ سکیں۔

رقیہ نے جس طرح پردے کو تنقید اور مذمت کا ہدف بنایا۔ اس سے بنگال میں کافی ہلچل مچی۔ بہت ایسے پڑھنے والے جنہیں پردے کی پابندیوں کا علم نہ تھا اور جو اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ پردے کے نام پر مذہب کے اصولوں کو کس طرح مسخ کیا گیا ہے وہ ششدر رہ گئے۔ قدامت پسند مسلمان تو باقاعدہ خفا ہو گئے۔ زیادہ تر مسلمان اس سارے معاملے کی صورت حال سے جھینپ گئے اور کچھ کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ جو بات اب تک پردے میں تھی اسے کھلے بندوں کیوں کہا گیا۔

بہت سے رسالوں پرچوں میں، خاص طور پر جو مسلمان نکالتے تھے جیسے ''محمد'' وغیرہ بہت لے دے ہوئی، رقیہ پر پہلے یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے معاشرے پر عیسائی مشنریوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر تازیانہ لگایا ہے۔ ایک بے حد ناراض نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا: ''انہیں ہر ہندوستانی چیز بری لگتی ہے اور ان کے لئے ہر وہ چیز اچھی ہے جس کا تعلق امریکہ یا یورپ سے ہے۔'' ''عزلت نشین'' میں دیے گئے واقعات ناگوار بھی تھے اور ناقابل قبول بھی۔ ابھی تک مسلمانوں کو یہ ناز تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں عورتوں کے معاملے میں وہ بہت فیاض ہیں اور اس بات پر انہیں ہندوؤں پر برتری حاصل تھی لیکن جو بات ان کی نظر سے اوجھل رہی وہ یہ تھی کہ ہندو عورتوں کی زندگی میں انیسویں اور بیسویں صدی میں اصلاحات کے حوالے سے انقلابی تبدیلی آچکی تھی۔ ۱۹۲۰ء کی ہندو عورت، پہلے کی طرح محروم نہ تھی۔ انہیں اپنی عورتوں کی اصلی حالت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ معاشرتی ناہمواریوں کی اس حقیقت سے وہ اس قدر بے خبر تھے کہ کیتھرین میو کے چبھتے ہوئے طنز بھی انہیں محسوس نہ ہوئے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کا نشانہ تو ہندو عورتیں تھیں۔ رقیہ نے یہ ہی سب باتیں مسلمان عورتوں کے لئے کہیں۔ مادر ہندوستان کے چہرے سے، رقیہ نے جو نقاب اٹھائی اس کا اثر براہ راست مسلمانوں پر پڑا۔ کچھ نے تو ''عزلت نشین'' کو رقیہ کی افسانہ طرازی قرار دیا۔ ایک نافذ کے لفظوں میں ''پڑھنے والے خوش ہو جاتے اگر

عزت ماب مصنفہ پردے کی مخالفت میں قصہ گھڑ کر نہ سناتیں۔''

مگر کچھ ہی دنوں میں مخالفوں کو منہ کی کھانا پڑی۔ رقیہ کی بات کو نوجوان مسلمان اور عورتوں نے بڑا سراہا۔ ''عزلت نشین'' ان کے لئے ایک مستند حوالہ ٹھہری اور رقیہ ان کے لئے آگے بڑھنے کے حوصلہ کی علامت۔

متن کے حوالے سے ایک عرض:

یہ ترجمہ اس متن پر مبنی جو رقیہ کی رچناولی میں شامل ہے۔ بہت سی اصل تراکیب ویسی کی ویسی رہنے دی گئی ہیں۔ ایک زبان کے لفظوں کو دوسری زبان کے طرز تحریر میں لکھنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں ایک سے زیادہ زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو الفاظ کی تحریر، تلفظ کے قریب تر ہو۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں مستعمل نام اور مقامی زبان کے وہ الفاظ جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا، ان کے ہجے انگریزی زبان کے اصولوں کے مطابق رکھے گئے ہیں۔

MashalBooks.org

رقیہ سخاوت حسین

''عزلت نشین'' سے انتخاب

مصنف کا حرف تعارف:

ایک طویل عرصہ سے ہم عزلت نشین کے عادی ہیں۔ اس لئے ہمارے اور بالخصوص میرے پاس، اس عزلت نشینی کے بارے میں کہنے کو کچھ خاص نہیں ہے اگر کوئی کسی مچھیرن سے پوچھے کہ ''بسی ہوئی مچھلی تمہیں بھلی لگتی ہے یا بری؟'' تو وہ غریب کیا جواب دے پائے گی۔

میں اپنی بہنوں کے سامنے چند واقعات پیش کرنا چاہتی ہوں، مجھے توقع ہے کہ یہ ان کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ پورے ہندوستان میں عورتوں کو علیحدہ کر کے رکھنے کا رواج ہے۔ صرف مردوں سے ہی نہیں ان عورتوں سے بھی، جو خاندان اور برادری کی نہیں ہوتیں۔ قریبی رشتہ دار خواتین اور اعتبار والی خادماؤں کے علاوہ کنواری لڑکیوں پر بھی کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

شادی شدہ خواتین، خانہ بدوش عورتوں، میراثنوں، ڈومینوں اور ناچ تماشے والے طائفہ کی عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ ان عورتوں میں جو سب سے زیادہ

اندھیرے کونوں کھدروں میں، الو کی طرح چھپتی پھرتی ہیں، ان ہی کی تربیت زیادہ امیرانہ وضع کی سمجھتی جاتی ہے۔

شہر کی کھاتی پیتی خواتین بھی انگریز مشنری عورتوں کو دیکھ کر دبک جاتی ہیں۔ یہ انگریز عورتیں تو ایک طرف رہیں، اپنی ہندو یا عیسائی عورتیں بھی نظر پڑ جائیں تو بھی دوڑ کر اپنی خواب گاہ میں جا چھپتی ہیں۔ حالانکہ ان عورتوں کا لباس وہی اپنی مانوس ساڑھی ہوتا ہے۔

رپورٹ نمبر 1

بہت پہلے کی بات ہے کہ ضلع رنگ پور کے گاؤں پیرابند کے زمیندار کی بیٹیاں ظہر کی نماز کے لئے وضو کر رہی تھیں۔ باقی سب نے تو وضو پورا کر لیا لیکن بی بی ''الف'' ابھی آدھا ہی وضو کر پائی تھیں۔ ان کی ذاتی خادمہ، آلتر ماں، پیتل کے لوٹے سے ان کی ہتھیلیوں پر پانی ڈال رہی تھی۔ اچانک ایک کابلی عورت پچھلے دروازے سے زنانہ صحن میں داخل ہوئی۔ آلتر ماں کے ہاتھوں سے لوٹا گر پڑا اور اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا، ''یہ مردوا کہاں سے گھس آیا؟'' عورت ہنس دی اور شکایتاً بولی: ''مردوا، کون سا مردوا؟'' ''ارے میں تو عورت ہوں۔'' بی بی ''الف'' جیسے اپنی جان بچا کر بھاگیں اور اپنی پھوپھی کے کمرے میں جا کر دم لیا۔ ڈر کے مارے تھر تھری چھوٹی ہوئی، بس اتنا ہی کہہ پائیں: ''بوا دشلوار پہنے ایک عورت اندر گھس آئی ہے۔'' خاتون خانہ کا تو رنگ فق ہو گیا۔ ''تمہیں تو نہیں دیکھ لیا کہیں اس نے؟'' بی بی الف نے جن کے آنسو اب روکے نہ رک رہے تھے، سر ہلا کر ہاں کا اشارہ کیا۔ گھر کی دوسری عورتیں نماز چھوڑ چھاڑ گھر کے دروازے بند کرنے کو دوڑیں کہ کہیں کابلی عورت کی نظر دوسری لڑکیوں پر نہ پڑ جائے۔ جس تیزی اور گھبراہٹ میں وہ یہ سب کچھ کرتی پھر رہی تھیں، اس سے لگتا تھا کہ جیسے جنگل سے کوئی چیتا چھوٹ کر صحن میں آن گھسا ہو۔

رپورٹ نمبر 7

کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے، ایک بنگالی زمیندار کے ہاں شادی ہو رہی تھی، گھر

مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رات کافی ہوگئی تھی، گھر والے سب سو رہے تھے سوائے چند چوروں کے، جن کی نیت گھر لوٹنے کی تھی۔ ایک چور ایک کمرے کی کچی دیوار میں نقب لگا کر گھس گیا۔ چوکیدار کو شبہ ہوا تو اس نے گھر کے مالک کو جگایا۔ زمیندار اور اس کے پانچ بھائی خاموشی سے ہتھیاروں سے لیس ہو کر، چور کو ڈھونڈنے لگے۔ اس چور کی دیدہ دلیری پر ان سب کو بے حد غصہ تھا۔

اتنی دیر میں چور اس بڑے کمرے میں جا گھسا جہاں بہت سے مہمان سو رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے ایک اجنبی کو آتے دیکھا، عورتوں نے دم سادھ کر سر تک چادریں تان لیں۔ چور نے اطمینان سے دیوار توڑی اور جو کچھ لے جانا چاہتا تھا لے کر صاف نکل گیا۔ جب وہ ایک بیگم کے پاس پہنچا اور ان سے ان کے گہنے مانگے تو باقیوں نے زبان ہلائے بغیر اپنے گہنے اتارنا شروع کر دیے۔ چور نے جو یہ دیکھا تو سوچا کہ فائدہ اسی میں ہے کہ خاموشی سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا رہے۔ بدقسمتی سے ان عورتوں میں ایک نئی نویلی دلہن بھی تھی، جس نے کسی نہ کسی طرح اپنی بڑی سی نتھ تو اتار لی، لیکن اپنے بھاری جھمکے کانوں سے نہ اتار پائی۔ وہ اس کے بالوں میں بے طرح الجھ گئے تھے۔ چور جو ابھی تک تو بڑی تمیزداری سے خاموشی سے بیٹھا تھا، اب اس سے نہ رہا گیا۔ تیز چاقو سے اس نے جھمکے کان زخمی کر کے اتار لئے اور یہ جا وہ جا۔

اندر کمرے میں تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور باہر مرد پوری طرح مسلح چور کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ عورتیں ان کے قدموں کو چاپ سن رہی تھیں مگر انہوں نے منہ سے آواز تک نہ نکالی، کہیں یہ نامحرم ان کی آواز نہ سن لے۔ جیسے ہی چور کمرے سے بھاگا انہوں نے چلانا شروع کر دیا۔

سو میری بہنو، دیکھا ہم پردے کی اس روایت کو کس کس طرح سر چڑھاتے ہیں۔

رپورٹ نمبر 8

ایک دفعہ ایک گھر میں آگ لگ گئی۔ گھر کی مالکہ نے حاضر دماغی سے سب گہنا پاتا

ایک پوٹلی میں سمیٹا اور اپنے کمرے سے تیزی سے باہر نکلیں۔ دروازے پر پہنچ کر دیکھا کہ آنگن تو غیر لوگوں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ سب آگ بجھانے کی فکر میں تھے۔ اب ان سب کے سامنے یہ کیسے باہر نکلتیں۔ اپنی پوٹلی تھامے وہ پھر اپنے کمرے میں جا کر پلنگ کے نیچے چھپ گئیں۔ جل کر خاک ہو گئیں، پردہ زندہ باد!

رپورٹ نمبر 11

۱۹۲۶ء میں، میں بہار کے ایک چھوٹے سے شہر آرا گئی۔ میری دو نواسیوں کی شادی تھی۔ اصل میں یہ دونوں میری سوتیلی بیٹی کی بچیاں تھیں۔ میں ان کی شادی میں شرکت کرنے گئی تھی۔ ان دونوں لڑکیوں کے پیار کے نام منگو اور سابو تھے۔ میں پہنچی ہوں تو وہ دونوں مائیوں بیٹھ چکی تھیں۔ کلکتہ میں لڑکیاں چار پانچ دن ہی مائیوں بیٹھتی ہیں مگر بہار میں یہ عرصہ چھ سات مہینہ کا ہوتا ہے۔

مجھ سے منگو کی کوٹھڑی میں زیادہ دیر نہ رہا گیا۔ اس تنگ جگہ میں میرا دم گھٹنے لگا تھا، میں نے کھڑکی کھول دی۔ ابھی دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک مزاج دار بیگم نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی اور بدمزاجی سے بولیں: ''دلہن مائیوں میں ہے۔'' مجھے ہی کمرے سے جانا پڑا۔ سابو کے کمرے میں تو میں ایک پل بھی نہ ٹھہر سکی اور وہ بے چاری بچیاں ان عقوبت خانوں میں چھ مہینے سے تھیں۔ آخر میں سابو غریب کو تو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ ہم اپنی بچیوں کو تنہائی کی زندگی برداشت کرنے کی تربیت اس طرح دیتے ہیں!

رپورٹ نمبر 14

یہ واقعہ کوئی چھبیس برس پہلے پیش آیا۔ میرے میاں کی ایک دور پار کی خالہ بھاگلپور سے پٹنہ جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ صرف ان کی نوکرانی تھی کیوں کہ جنکشن پر انہیں ریل گاڑی بدلنا تھی۔ ڈبے میں چڑھتے ہوئے میری خلیا ساس اپنے برقعے میں الجھ کر گر پڑیں۔ نوکرانی نے انہیں اللہ کا واسطہ دے کر مالکہ کے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ اس نے خود مالکہ کو اٹھانے کی کوشش کی مگر یہ کام

اس کے بس کا نہ تھا۔ گاڑی نے آدھا گھنٹہ انتظار کیا، بس اس سے زیادہ نہیں۔

بیگم کا بدن کچل گیا اور برقعہ تار تار رہا۔ اسٹیشن مردوں سے بھرا تھا مگر کسی کو نوکرانی کی مدد کرنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر کو ان کا کچلا ہوا جسم سامان کے شیڈ میں لے جایا گیا۔ نوکرانی رو رو کر جان دیے دیتی تھی۔ گیارہ گھنٹے کی ناقابل گفت اذیت کے بعد آخر کو وہ دم توڑ گئیں۔ ایسی کرب ناک موت سے خدا بچائے۔

رپورٹ نمبر 17

کوئی چودہ برس پہلے کی بات ہے، ہمارے اسکول میں لکھنؤ کی ایک استانی تھیں۔ ان کا نام اختر جہاں تھا، ان کی تین بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ایک دن وہ نئے زمانے کی لڑکیوں کی آزادہ کی باتیں کر رہی تھیں اور ان کا ہدف ان کی تین بیٹیاں تھیں جو ان کے خیال میں بہت دیدہ دلیر ہوگئی تھیں۔

پھر وہ اپنی جوانی کا ذکر کرنے لگیں۔ انہیں اپنی شادی کے فوراً بعد کا ایک غیر معمولی وواقعہ یاد آ گیا۔ گیارہ برس کی تھیں تو ان کا بیاہ ہو گیا تھا۔ جب وہ اپنی سسرال گئیں تو کونے کا ایک کمرہ انہیں رہنے کو دیا گیا۔ یہ باقی گھر سے الگ تھلگ ذرا اکیلا تھا۔ ان کی چھوٹی نند دن میں تین چار مرتبہ ان کے پاس چکر لگاتی تا کہ ان کا کوئی کام وام ہو تو کر دے۔ خاص طور پر غسل خانے تک ان کے ساتھ جاتی۔ ایک دن جانے کیا وجہ ہوئی کہ بڑی دیر گزر گئی اور وہ نند نہ آئی۔ بیچاری دلہن کو غسل خانے جانے کی اشد حاجت تھی مگر وہ اکیلی کیونکر جا پاتیں۔ نئی نویلی دلہنیں اپنے آپ گھر میں اکیلے نہیں چلتی پھرتی تھیں۔ یہ بات قاعدے قرینے کے خلاف تھی۔ لکھنؤ کی دلہنوں کے ساتھ، جہیز میں پاندان آیا کرتا تھا۔ ان کی خوابگاہ میں بھی یہ بڑا سا پاندان موجود تھا۔ انہوں نے پاندان سے چھالیہ اور سارا مال مصالحہ نکال ایک پوٹلی میں باندھا۔ اب اس پاندان کو کس استعمال میں لایا گیا، یہ بتانا اختیار میں نہیں۔ شام کو جب ان کے میکے سے ایک خادمہ بستر بنانے آئی تو انہوں نے رو رو کر پاندان کی درگت بننے کا حال سنایا۔ اس نے انہیں بہت دلاسہ دیا اور کہا کہ ''بس اب تم اپنا جی

برا نہ کرو، میں اسے قطعی کروادوں گی دوبارہ۔ اور اتنے دن پان چھالیہ پوٹلی میں ہی بندھے رہنے دو۔"

رپورٹ نمبر 18

لاہور کے ایک ڈاکٹر نے پردے کے بارے میں اپنا تجربہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

"جب کبھی وہ کسی پردہ نشین گھرانے میں مریض دیکھنے جاتے تو دو خادمائیں پلنگ کے سامنے ایک کمبل تانے ملتیں۔ وہ اپنا ہاتھ کمبل کے نیچے سے گزار کر دوسرے سرے تک پہنچانے کی کوشش کرتے تا کہ مریض کی نبض دیکھ سکیں (ایک دن ایک خاتون نے جو خود پردہ نشین نہیں تھیں مجھ سے پوچھا کہ اگر کہیں کوئی خاتون ڈاکٹر نہ ہو تو پھر مرد ڈاکٹر کو زبان کا معائنہ کیسے کرایا جائے؟ کمبل میں سوراخ کر کے زبان تو اس میں نکالی نہیں جاسکتی۔" میں اپنی طرف سے اپنی بہنوں سے ایک سوال اور اضافہ کرنا چاہوں گی شاید میری بہنوں کو جواب مل جائے۔ وہ ڈاکٹر کو اپنی آنکھیں، کان اور دانت کیسے دکھائیں گی؟"

(ڈاکٹر نے مجھے بتلایا) "ایک بیگم صاحبہ کو نمونیہ ہو گیا۔ میں نے کہا، پھیپھڑوں کی کیفیت کا معائنہ ضروری ہے، میں پشت سے ہی دیکھ لوں گا۔ نواب صاحب نے فرمایا: "خادمہ کو بتا دیجئے آلہ کہاں کہاں رکھنا ہے۔" اب یہ تو عام سی بات ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اسٹیتھو سکوپ کو ادھر ادھر گھما کر رکھنا پڑتا ہے تا کہ تشخیص صحیح ہو سکے۔ لیکن مجھے تو نواب صاحب کا حکم ماننا تھا۔ خادمہ نے آلہ کا دوسرا سرا پکڑا اور کمبل کے اندر کہیں رکھا۔ چند لمحوں بعد تو میں واقعی پریشان ہو گیا، ذرا سی آواز بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ گھبرا کے یکبارگی کمبل کے کونے سے میں نے جھانکا، میرے غصہ اور کوفت کی انتہا نہ رہی کہ اسٹیتھو سکوپ بیگم کی کلائی پر رکھا تھا۔ میں مارے غصہ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ نواب صاحب کا حوصلہ دیکھئے، مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میری تشخیص کیا ہے؟ تشخیص...... کیا وہ مجھے عالم غیب سمجھتے تھے؟"

MashalBooks.org

رپورٹ نمبر 23

دوسروں کے تجربوں کو تو چھوڑیے۔ میں آپ کو پردے کے متعلق اپنے تجربات بتاتی ہوں۔ جیسے ہی مجھے چھٹا سال لگا، مجھے تو عورتوں سے بھی چھپنا پڑا۔ اس کی منطق میری سمجھ میں نہیں آتی تھی، پھر بھی غیروں کو آتے دیکھ کر میں غائب ہو جاتی۔ مرد کو خیر زنان خانے میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے مجھے ان کا خوف نہ تھا لیکن عورتیں تو زنان خانے میں آزادی سے آ جا سکتی تھیں اور مجھے ان سے چھپنا ہوتا۔ گاؤں کی عورتیں وقت بے وقت چلی آتیں۔ فوراً ہی کوئی اشارہ کرتا اور میں آس پاس چھپنے کو جگہ ڈھونڈھتی۔ باروچی خانے میں، خادماؤں کے بستروں کے ڈھیر تلے حتیٰ کہ پلنگوں کے نیچے تک۔

میں ان کونوں کھدروں کی طرف اس طرح بھاگتی جس طرح چوزے مرغی کی کڑک پر چیلوں اور شکروں سے بچنے کو مرغی کے پروں تلے پناہ ڈھونڈتے ہیں، لیکن اس میں ایک فرق تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ چوزے تو جبلی طور پر خطرے کے اشارے کو سمجھ جاتے ہیں۔ میرے پاس تو ایسی کوئی جبلی صلاحیت بھی نہیں۔ اس لئے بہت دفعہ میں ان اشاروں کو سمجھ نہ پاتی اور چھپنے میں دیر ہو جاتی۔ ایسے وقتوں میں خاندان کی بڑی بوڑھیاں ''میری جیسی نئے زمانے کی بے شرم اور بے لحاظ'' لڑکیوں کی ہجو پڑھنے سے نہ ہچکچاتیں۔ میری عمر کوئی پانچ برس کی ہو گی جب ہم کلکتہ میں کچھ عرصہ رہے۔ ایک دفعہ میری جیٹھانی کی خالہ دو نوکرانیاں ساتھ لے کر ہم سے ملنے آئیں، ان دونوں کو تو سارے گھر میں گھومتے پھرنے کی کھلی چھٹی تھی اور میں ہرن کی طرح جس کے پیچھے شکاری لگے ہوں، کونوں کھدروں کی تلاش میں بھاگی پھرتی۔ کبھی دروازوں کے پیچھے، کبھی میزوں کے نیچے۔ عام طور پر میں تیسری منزل کی ایک صحنچی میں جا چھپی، جہاں گھر والے بھی کم ہی آیا جایا کرتے تھے۔ میری آیا صبح کو مجھے وہاں لے جاتی اور میں پورا پورا دن وہاں رہتی۔ جب ان دونوں نوکرانیوں نے سارا گھر کھنگال ڈالا، تو انہیں اس صحنچی کو دیکھنے کا خیال آیا۔ میری بڑی بہن کا بیٹا، ہالو بھی پانچ برس کا تھا۔ دوڑتا ہوا مجھے اس آفت سے باخبر کرنے آیا۔ خوش نصیبی

سے وہاں ایک پرانا چھپر کھٹ تھا۔ میں اس کے نیچے جا چھپی اور ان دونوں کے ڈر کے مارے دم سادھے پڑی رہی۔ وہاں دو چار خالی صندوق اور پرانے اسٹول پڑے تھے۔ بے چارے ہالو نے اپنا سارا زور لگا کر، جتنا کہ ایک پانچ سال کے بچے سے ممکن ہوسکتا ہے دو چار کو کھسکا کر ادھر کر دیا، جدھر میں چھپی تھی۔ ہم دونوں نے مل ملا کر کچھ اس طرح کا انتظام کیا کہ میرے گرد اچھی خاصی روک ہو جائے۔ ہالو کے سوا کوئی بھی تو میرا حال پوچھنے نہ آیا۔ وہ کبھی کچھ کھانے کو اور کبھی پینے کو لا دیتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ نیچے کوئی چیز لینے جاتا اور پھر دیر تک پلٹ کر نہ آتا۔ وہ بے چارا خود بھی تو بچہ ہی تھا اور کھیل کود میں لگ کر بھول جاتا ہوگا۔ لیکن مجھے اس مصیبت میں چار دن کاٹنا پڑے۔

رپورٹ نمبر 25

میں نے گیارھویں رپورٹ میں اپنی نواسیوں کی شادی میں آ راجانے کا ذکر کیا ہے، لیکن میں نے وہاں شہر کیا خاک دیکھا۔ سوائے گھر کی دیواروں اور آسمان کے، جب میں نے اپنی ''بیٹی'' (دراصل یہ وہ لڑکی تھی جس سے میرے داماد نے میری سوتیلی بیٹی کی وفات کے بعد شادی کر لی تھی) اسے بات کی تو اس نے میری منت کی کہ آپ اپنے داماد سے کہیے کہ وہ آپ کو شہر گھما لائیں۔ آپ کے بہانے ہم بھی دیکھ لیں گے۔ سات سال ہو گئے ہیں یہاں رہتے لیکن ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ نئی نویلی دلہنیں سابو اور منگو بھی ہم آواز ہو کر بولیں ''ہاں، نانی جان خدا کے لئے اگر آپ ابا سے بات کر لیں تو.....''

میں نے اپنے داماد سے کہا کہ وہ ایک گاڑی کرائے پر لے لیں تا کہ ہم شہر میں گھوم پھر سکیں۔ دو چار دن تو وہ بڑے سلیقے سے یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ کوئی مناسب سواری مل نہیں پا رہی۔ آخر خدا خدا کر کے ان کا گیارہ سال کا بیٹا بھاگتا ہوا اندر یہ بتانے آیا کہ گاڑی تو مل گئی ہے لیکن کھڑکی ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ منگو گڑگڑائی، ''اب اسے واپس مت جانے دینا، ہم اس کھڑکی پر پردہ ڈال دیں گے، کیوں نا؟'' سابو نے کھسر پھسر کی۔ ''اچھا ہے، اس سوراخ سے ہم مزے میں دیکھ سکیں گے۔'' ہم تو تیار تھیں جب بھی یہ پوچھا جاتا کہ اب جائیں تو جواب ملتا

کہ ذرا ٹھہرو، سواری کے پردے ٹھیک نہیں تھے۔ آخر جب ہم سواری میں بیٹھنے کو نکلیں تو میں نے دیکھا کہ سواری بمبئی کی تین بھاری ساڑھیوں سے منڈھی ہوئی ہے، سبحان اللہ۔ میرے داماد نے اپنے ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بند کیا اور ساڑھی کے کونے بھی اپنے ہاتھوں سے باندھے۔ ذرا دیر بعد منگو نے سابو کو طعنہ دیتے ہوئے کہا ''تو جناب کہاں ہے وہ سوراخ جس سے ہم شہر کی رونق دیکھنے والے تھے؟'' ذرا دیر کی تلاش کے بعد لڑکیوں کو ساڑھی کا ذرا سا پھٹا ہوا حصہ مل گیا۔ منگو، سابو اور ان کی ماں باری باری اس میں باہر کا تماشا کرتی رہیں۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں بھی ان کے ساتھ تماشے کی اس لائن میں لگ جاتی۔

رپورٹ نمبر 29

میں نے علی گڑھ میں عورتوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ بہت سی مندوبین مختلف طرح کے برقعے اوڑھے ہوئے تھیں۔ ایک تو بالکل ہی عجیب سا تھا، میں نے جب اس طرف توجہ دلائی تو خاتون فوراً بولیں:

''خدا کے لئے برقہ کی بات مت کریں، میرا تجربہ بہت خراب ہے۔'' اور انہوں نے اپنے کچھ تجربات سنائے۔

ایک دفعہ وہ بنگالی ہندوؤں کے ایک خاندان کی شادی میں شریک ہوئیں۔ بچوں نے جو انہیں برقعے میں آتے دیکھا ڈر کے مارے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور ادھر ادھر چھپنے لگے۔ ان کے شوہر کے کچھ ہندو بنگالی دوست تھے۔ ایک دفعہ تو ان کے یہاں بھی ملنے کو جانا پڑا۔ جس گھر میں بھی وہ گئیں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بچے برقعہ دیکھتے ہی چیخیں مارنا شروع کر دیتے اور ڈر کے مارے ان کو کپکپی چھوٹ جاتی۔

ایک دفعہ وہ کلکتہ گئیں، ایک شام وہ اپنی دوسری برقعہ پوش ساتھیوں کے ساتھ کھلی چھت والی کار میں کہیں باہر گئیں۔ رستے میں جہاں بھی بچے انہیں دیکھتے چلانا شروع کر دیتے۔ ''ہے بھگوان، کون ہیں یہ؟'' ایک نے سب کو چپ کرایا اور بولا، ''میری مانو، یہ بھوت ہیں؟'' ان کی

برقعے کی نقاب جب ہوا سے اڑی تو کسی نے کہا، ''دیکھو دیکھو، بھوت ہاتھیوں کی طرح اپنی سونڈ ہلا رہے ہیں۔ ارے بابا بھاگو، یہ تو ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔

ایک دفعہ دارجیلنگ ان کا جانا ہوا۔ گھم کے اسٹیشن پر لوگ ایک بونے کے گرد اکٹھے تھے، اس کا قد ساتھ آٹھ سال کے بچے کا سا تھا مگر چہرہ ایک پورے بالغ آدمی کا۔ ڈاڑھی مونچھ سمیت۔ اچانک انہیں ایسا لگا کہ اب مجمع کی آنکھیں ان پر لگی ہیں۔ اب بونے سے انہیں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی، ان کا برقعہ اس سے بڑا تماشا تھا۔

دارجیلنگ پہنچ کر انہوں نے کھانا کھا کر سیر کرنے کا ارادہ کیا۔ بازار تک جانے کو انہوں نے رکشہ کیا، بازار میں اس وقت بڑی بھیڑ تھی۔ لوگ تبت سے بھاگے ہوئے سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے، ان کے رکشہ والے نے رکشہ ایک کنارے کھڑا کیا اور خود بھی لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ رستہ چلتے لوگ ان کے رکشے میں جھانک کر گزرتے تھے۔ جب کبھی وہ ٹہلنے جاتیں تو کتے بھونک کر پیچھا کرتے۔ کسی گھوڑے کے سامنے آجاتیں تو وہ بدک جاتا۔ ایک دفعہ وہ چائے کے باغات دیکھنے گئیں تو ایک گوڑکھا لڑکی نے مارنے کو پتھر اٹھا لیا۔

ایک مرتبہ وہ چار پانچ برقعہ پوشوں کے ساتھ سیر کر رہی تھیں۔ ایک ندی کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ کنکریوں پر لڑکھڑا کر گر پڑیں۔ پاس کے باغ میں کام کرنے والے دوڑ کر آئے اور انہیں بچایا۔ ایک نے ہمدردی کرتے ہوئے مذاقاً کہا: ''اپنا آپ تو دیکھو، جوتے بھی پہن رکھے ہیں اور یہ بورا بھی لپیٹ رکھا ہے۔ ندی میں نہ گرتیں تو اور کیا ہوتا۔ افسوس بیگیوں کی کشیدہ کاری کی نقابیں مٹی میں لتھڑ گئیں اور ان کے برقعے بھیگ کے چورا ہو گئے۔

اس سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جدھر سے بھی گزرتیں، مائیں اپنے بچوں کو چپ کرانے کو کہتیں۔ چپ، چپ، وہ دیکھو مکہ اور مدینہ جا رہی ہیں۔ دیکھا تم نے ان نقاب پوش چڑیلوں کو، یہ مکہ اور مدینہ ہیں۔''

رپورٹ نمبر 37

ہندوستان کے مغربی صوبوں سے ایک ٹرین کلکتہ آرہی تھیں۔ بالی کے اسٹیشن پر تین برقعہ پوش خواتین زنانے ڈبے میں سوار ہوئیں۔ اس ڈبے میں اور بہت سی مسلمان عورتیں بھی تھیں۔انہیں یہ بات عجیب سی لگی کہ ٹرین اسٹیشن سے چھوٹ بھی گئی تب بھی انہوں نے اپنی نقاب نہیں ہٹائی۔ پھرانہیں کچھ شبہ ہونے لگا۔ان نوواروں کی قدوقامت بھی عام عورتوں کی سی نہ تھی۔ کچھ اس کی بھی ہیبت تھی۔عورتیں دل ہی دل میں دعائیں مانگتی رہیں، اتنے میں ٹرین سایوا کے اسٹیشن پررُکی۔ جیسے ہی خاتون ٹکٹ کلکٹر اس ڈبے میں آئیں ایک نے ان تین عورتوں کی شکایت کی۔اس سے پہلے کہ ٹکٹ کلکٹر ان کی طرف بڑھتیں، کنارے پر بیٹھی ہوئی ان میں سے ایک نے دوسرے پلیٹ فارم کی طرف چھلانگ لگادی اور بگٹٹ بھاگنا شروع کیا۔ٹکٹ کلکٹر نے ''پولیس، پولیس'' کی پکارشروع کی اور ایک کو پکڑلیا۔ جب نقاب الٹی تو ڈاڑھی مونچھ والا ایک چہرہ سامنے تھا۔ٹکٹ کلکٹر ہکابکارہ گئیں اور بس اتنا ہی کہہ پائیں، ''ڈاڑھی مونچھ اور برقعے میں؟''

رپورٹ نمبر 38

ڈاکٹر شرٹ کماری ترا اگلے دن مجھے بتارہی تھیں،تم مسلمان بی بیاں میرے لئے کیسی کیسی مشکل کھڑی کردیتی ہو، ذراسی بروقت مدد کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ چاہے کچھ بھی ہو، گرم پانی یا صاف پٹی ذرا ذرا سی چیز کے لئے اس قدر انتظار، اتنی دیر۔

دور پار کے گاؤں سے ایک دفعہ ایک نوکر انہیں بلانے آیا کہ گھرانے کی چھوٹی بیگم کو چل کے دیکھ لیں۔ دانت کے درد سے بے حال ہیں وہ،نوکر نے ڈاکٹر کو بتلایا۔ڈاکٹر نے دوائیں اوردانت نکالنے کا ساز وسامان ساتھ لیا۔ جب وہ وہاں پہنچیں تو پتہ چلا کہ چھوٹی بیگم دانت کے درد سے بے حال نہ تھیں انہیں تو دردزہ لگے تھے! اب ڈاکٹر کیا کرے؟ وہ جام گاؤں میں تھیں جوان کے شہر بھاگلپور سے آٹھ میل دور تھا۔ اب وہی گھوڑا گاڑی تو انہیں الٹے پاؤں واپس نہیں لے جاسکتی تھی۔ گھوڑے ہانپ چکے تھے مگر جام گاؤں تو دیہات تھا،گھوڑا گاڑی یا پالکی وہاں کہاں ملتی۔

MashalBooks.org

خیر کسی نہ کسی طرح وہ بھاگلپور پلیٹیں تاکہ بچے کی پیدائش کا ضروری سامان اور دوائیں لے جاسکیں۔ جب تک وہ جام گاؤں پہنچی ہیں، مریضہ کا تو برا حال تھا۔ گھر کی مالکن سے جب ڈاکٹر ترا نے پوچھا کہ مریضہ کے متعلق انہیں غلط اطلاع کیوں دی گئی تو بڑی بیگم نے فرمایا ''ایک مرد کو جانا تھا آپ کے پاس۔ اب میں دانت کے درد کے سوا اس سے اور کیا کہتی؟ ایک مرد کو اصلی بات کیسے بتاتی؟ ہم دونوں کے لئے یہ بات شرمندگی کی ہوتی، کیسی لیڈی ڈاکٹر ہو تم، اس بات کا ذرا خیال لحاظ نہیں تم کو!''

رپورٹ نمبر 47

ایک شاعر کے لفظوں میں:۔

نہ کہانی، نہ گیت، زندگی ہے یہ تو
یہ کوئی تماشہ گھر نہیں، میرا گھر ہے یہ تو

تین برس پہلے ہمارے اسکول میں بس آئی۔ بس کے آنے سے ایک دن پہلے ہماری ایک انگریز استاد، بسوں کے دفتر میں بس دیکھنے گئیں۔ ان کا پہلا ردعمل یہ تھا، ''اس بس میں تو اس قدر اندھیرا ہے۔ میں تو اس میں کبھی بھی نہیں بیٹھوں گی۔ جب بس آئی تو پتہ چلا کہ اگلے اور پچھلے دروازوں پر جو پتلی سی بیل بنی تھی، اس کے سوا روشنی اور ہوا کا کہیں سے گزر نہ تھا۔ تین انچ چوڑی اور اٹھارہ انچ لمبی اس بیل کے سوا ساری بس دم بخت تھی۔

اسی دن دوپہر کو لڑکیاں بس میں گھروں کو گئیں۔ اسکول کی جو ملازمہ لڑکیوں کے ساتھ گئی تھی اس نے بتایا کہ بس میں گرمی کا وہ عالم ہے کہ الحساب۔ لڑکیاں بھی بے حد بے آرام رہیں۔ کچھ کو کوفے بھی ہوگئی اور چھوٹی بچیاں اندھیرے سے ڈر کر سسکیاں لیتی رہیں۔

اس سے پہلے کہ اگلے دن صبح بس لڑکیوں کو لینے جاتی۔ ہماری انگریز استاد نے پچھلے دروازے کی کھڑکی کھول دی اور اس پر رنگین پردے لٹکا دیے۔ اس کے باوجود بھی معلوم یہ ہوا کہ کچھ بچیوں کی طبیعت نے مالش کی، زیادہ کے سر میں درد ہوا۔ سہ پہر کو انہی استاد نے بس کے ادھر

ادھر کی کھڑکیاں کھول کران پر پردے ڈال دیے۔

اسی شام ایک ہندو سہیلی مسز مکر جی مجھ سے ملنے آئیں۔ اسکول کی ترقی کا حال سن کر خوش ہوئیں۔ اچانک بولیں، ''ہاں، کیسی اچھی بس ہے تمہارے اسکول کی۔ پہلے دن میں نے دیکھا تو سوچا کسی بڑے سے صندوق کو پہیے لگا دیے گئے ہیں۔ میرا بھتیجا دوڑ کر باہر گیا اور کہنے لگا ''ماسی، دیکھو تو کلکتہ کی کال کوٹھڑی کو پہیے لگا دیے کسی نے۔ سچ مچ، اس بس میں لڑکیاں کیسے آجا سکتی ہیں؟''

تیسرے دن سہ پہر کو بہت سی مائیں شکایت کرنے کو آئیں۔ انہوں نے کہا: ''یہ آپ کی بس خدا کا عذاب ہے۔ زندہ درگور کردیا آپ نے بچیوں کو!'' میں نے بے بسی سے کہا، ''کیا کیا جائے اگر بس کی یہ صورت نہ ہوتی تو آپ کو یہ شکوہ ہوتا کہ بس پردہ دار نہیں۔'' انہوں نے بڑی خفگی سے کہا: ''کیا مطلب آپ بچیوں کی زندگی کی قیمت پر پردہ کروانا چاہتی ہیں؟ ہم اپنی بچیوں کو اب آپ کے اسکول نہیں بھیجیں گے۔'' اس دن شام کو ملازمہ نے بتلایا کہ تمام والدین نے بس کی شکایت کی ہے اور دھمکی دی ہے کہ ایسی بس میں بچیاں نہیں آئیں جائیں گی۔''

اگلے دن شام کو مجھے چار خط ملے۔ ایک خط انگریزی میں تھا اور مکتوب نگار نے ''برادر اسلام'' کے دستخط کئے تھے۔ باقی تین اردو میں تھے، دو گمنام تھے، تیسرے پر پانچ لوگوں کے دستخط تھے۔ نفس مضمون سب کا ایک سا تھا، سب خیرخواہوں کی طرف سے تھے۔ میرے اسکول کی ابدی بھلائی کے لئے انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ہوا سے بس کی دونوں طرف کے پردے ہلتے تھے جس سے بے پردگی ہوتی ہے۔ اگر کل صبح تک احوال کی درستی کی کوئی صورت نہ ہوئی تو اسکول کے فائدے کے پیش نظر مختلف اردو اخباروں کو بس کی اس پردگی کے متعلق خط لکھے جائیں گے اور لڑکیوں کو ایسی بے پردہ بس میں سفر کرنے سے منع کر دیا جائے گا۔

کس مشکل میں تھی میں

''اگر ناگ نہ پکڑ پاؤں
تو راجہ گردن اڑا دے
اور جو کہیں چوک جاؤں
تو ناگ ڈس لے مجھ کو''

میرا نہیں خیال ایسے (ایسے برخود غلط نقادوں) ناگ کو کسی نے پکڑنے کی کوشش کی ہوگی تا کہ ایسے راجہ (ایسے بے تکے والدین) کی زبان سے نکلا پورا ہو۔ وہ عورتیں جو اس عزلت کی قید میں ہیں ان سے اتنا ہی کہوں گی:

اس دکھ بھری دنیا میں کیوں آئی؟
اس پردہ نشیں ملک میں پیدا کیوں ہوئی؟

روشن جہاں

''رقیہ'' ایک تعارف

رقیہ سخاوت حسین ۱۸۸۰ء میں پیرابند میں پیدا ہوئیں۔ موجودہ بنگلہ دیش کے شمالی ضلع رنگ پور کا ایک چھوٹا سا دیہات ہے۔ رقیہ کی پیدائش کے وقت یہ علاقہ انگریزوں کی عملداری میں بنگال پریذیڈنسی میں شامل تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش یقینی طور پر معلوم نہیں۔ یہ ایسی کوئی حیرانی کی بات نہیں، اس علاقے میں تو آج بھی پیدائش اور موت کے باقاعدہ اندراج کا دستور نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ۹ دسمبر ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئیں۔ اس کی سند ان کے بھتیجے ہیں، یہ تاریخ بھی شک کو دعوت دیتی ہے۔

اپنے والدین کے لئے رقیہ کا کہنا ہے: ''مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کا پیار کیا ہوتا ہے؟ ان کی اماں راحت النساء صابرہ چودھرانی کی ذات عجیب سایوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ ان کے ابا کی چار بیویوں میں سے پہلی بیوی تھیں۔ ان کی ایک سوت یوروپین بھی کہی جاتی ہیں۔ راحت النساء کے یہاں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں، رقیہ کو اپنی ماں کے پردے کی شدت سے پابندی یاد تھی۔ اپنی کتاب ''عزلت نشین'' انہوں نے اپنی ماں کے نام معنون کی تھی اور اس میں بھی اسی

بات کا ذکر تھا۔

رقیہ کے ابا ظہیر الدین محمد ابو علی صابر ایک بے حد قدامت پسند اور خراج زمیندار تھے جن کی وسیع و عریض جائداد قدیم طرز زندگی کی پشت پناہ تھی۔ کہا جاتا ہے انہیں پانچ زبانوں عربی، فارسی، اردو، پشتو، انگریزی، ہندی اور بنگالی پر عبور حاصل تھا۔ ان کے بچوں کو بھی زبانوں کا یہ شوق ورثے میں ملا تھا۔ اس وقت کے دوسرے مسلمان رؤسا کی طرح انہوں نے اپنے بیٹوں کی عربی، فارسی اور اردو سیکھنے کے لئے حوصلہ افزائی کی۔ بنگالی زبان تھی جو مسلمان نہ تھے۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ جدید تعلیم نوجوانوں کے لئے مفید اور وقار کا باعث بن سکتی ہے۔ خاص طور پر اس حوالے سے سرکاری ملازمتوں کے ملنے کے امکانات پر کشش معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے دو بیٹوں عبدالاسد ابراہیم صابر اور خلیل الرحمٰن ابو ضیغم صابر کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ پہلے ایک مقامی اسکول میں بنگالی اور انگریزی پڑھیں اور پھر ممتاز سینٹ زیویر کالج کلکتہ میں ان زبانوں کی تعلیم جاری رکھیں۔ اسی طرح ان کا میل جول ان صاحبان رسوخ سے ہوسکتا تھا جو سول سروس میں ان کی شمولیت کے لئے کچھ سہولت پیدا کر سکتے تھے۔

مگر جہاں تک بیٹیوں کی باقاعدہ رسمی تعلیم کا تعلق تھا، انہوں نے بے اعتنائی برتی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں اپنی بیٹیوں سے محبت نہ تھی۔ آج کل ایک نظر میں یہ فیصلہ دے دیں کہ شاید انہیں بیٹیوں سے محبت نہ تھی۔

اس وقت بنگال کے اشراف گھرانوں کی لڑکیوں کے لئے طریقہ یہ تھا کہ انہیں قرآن پاک کی ناظرہ تعلیم دی جاتی تھی۔ متن کے ترجمہ و تفسیر کا ذکر نہ تھا اور کچھ خاص گھرانوں میں اردو میں لکھی اخلاق و موعظت کی کتابیں پڑھا دیتے تھے تاکہ لڑکیوں کو اخلاق و آداب سے آگاہی ہو جائے۔ ان لڑکیوں کی بنگالی میں لکھی، کتابیں پڑھنے پر حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ رقیہ اور ان کی بہن کریم النساء اپنے گھر کے صحن میں اکڑوں بیٹھ کر لکڑی سے فرش پر بنگالی ابجد لکھا کرتیں۔ اس معاملے میں ان کا چھوٹا بھائی ان کا استاد تھا جو اسکول میں بنگالی اور انگریزی دونوں زبانیں

پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ ایک منظوم بنگالی کہانی پڑھنے میں محوتھیں تو ان کے ابا نے دیکھ لیا۔ مارے ڈر کے وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ ان کے ابا نے جوان کی یہ حالت دیکھی تو فوری طور پر انہیں بنگالی کتابیں پڑھنے سے روکا نہیں۔ رشتہ داروں کے طعنوں تشنوں نے یہ کام کر دیا۔ کریم النساء کو تو ابا نے ان کی ننھیالی جاگیر بلیادی بھجوا دیا، جہاں ان پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ ابھی پندرہ برس کی بھی نہ ہوئی تھیں کہ بیاہ دی گئیں مگر کریم النساء کی علم کی پیاس بجھی نہیں۔ انہوں نے رقیہ کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ بنگالی لکھنا پڑھنا جاری رکھیں۔ رقیہ نے یہ بات ''موتی چور'' کے دوسرے حصے کے انتساب میں بڑی خوبصورتی سے لکھی۔

''یہ کہ بھاگلپور کے طویل قیام (۱۴ سال)، میں نے بنگال کو ذہن سے فراموش نہ ہونے دیا۔ جہاں کوئی بنگالی بولنے والا تک نہ تھا۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا۔ یہ آپ کا خیال، توجہ اور حوصلہ افزائی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور مجھے متحرک رکھا۔ (بنگالی زبان میں تصنیف کے لئے۔)''

ساری زندگی رقیہ کے ذہن پر یہ بات حاوی رہی کہ انسانی صلاحیتیں کس طرح برباد ہو جاتی ہیں۔ کریم النساء کا مقدر ان کے سامنے تھا۔ روایتوں کی اندھی تقلید کو وہ بے معنی اور بے نتیجہ سمجھتی تھیں اور انہوں نے ارادے کی پختگی کے ساتھ اس کے خلاف جنگ جاری رکھی۔''

رقیہ نے پردے کی سختی کی سچی تصویریں کھینچی ہیں جس کا تجربہ انہوں نے خود اپنے گھر میں کیا تھا۔ بچپنے سے ہی انہیں اور ان کی بہن کو صرف مردوں سے ہی نہیں ان عورتوں سے بھی پردہ کرنا پڑتا تھا جو ان کے خاندان اور برادری کی نہیں ہوتی تھیں۔

نشوونما کے اہم سالوں میں رقیہ کو اپنے بڑے بھائی ابراہیم صابر سے بہت مدد ملی۔ انہوں نے رقیہ کی صلاحیتیں ضائع نہ ہونے دیں اور ان کو بڑھاوا دیا۔ ابراہیم صابر مغربی تہذیب اور تعلیم سے آشنا تھے اور عورتوں کی تعلیم کے بہت حق میں تھے۔ انہوں نے خود رقیہ کو بنگالی اور انگریزی کی تعلیم دی۔ رقیہ کی قریبی ساتھی اور پہلی سوانح نگار، شمس النساء محمود یہ بات سامنے لائیں

کہ گھر والوں کی روک ٹوک اور رشتہ داروں کے فضیحتے سے بچنے کے لئے دونوں بہن بھائی پڑھنے پڑھانے کے اس سلسلے کے لئے اس وقت تک انتظار کرتے جب تک سارے گھر والے سونے کے لئے نہ لیٹ جاتے اور خاص طور پر ان کے والد۔ اپنے بھائی کے لئے بے انتہا محبت اور شکر گزاری کا اظہار ان کے واحد ناول ''پدم راگ'' کے انتساب میں یوں عبارت ہے۔ ''تم نے بچپن سے میری تربیت کی...... تمہاری محبت شہد سے زیادہ میٹھی ہے، جس کے ذائقہ کے آخر میں کچھ تلخی بھی ہوتی ہے۔ یہ کوثر کی طرح پاک اور متبرک ہے۔ (جنت کی وہ نہر جس کا قرآن میں ذکر ہے۔)

رقیہ بڑی بھاگوان تھیں کہ انہیں ہمدرد اور مددگار عزیز ملے۔ شادی کے بعد بھی ان پر خوش نصیبی کا سایہ رہا۔ ان کے شوہر سید سخاوت حسین ایک سرکاری ملازم تھے۔ بنگال پریڈیڈنسی کے علاقہ بہار کے شہر بھاگلپور میں پیدا ہوئے، پٹنہ، کلکتہ اور لندن میں تعلیم پائی۔ جب سخاوت رنگ پور میں تعینات تھے تو ان کی ملاقات رقیہ کے بڑے بھائی ابراہیم سے ہوئی۔ ابراہیم ان سے بہت متاثر ہوئے۔ گو کہ سخاوت رنڈوے تھے اور عمر کے لحاظ سے تیس کے آخری پیٹے میں۔ ابراہیم نے اپنے گھر والوں کو اس بات پر منا لیا کہ وہ رقیہ کی شادی سخاوت سے کر دیں۔ ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی ہوگئی، رقیہ اس وقت صرف سولہ برس کی تھیں۔

سخاوت ایک آزاد خیال آدمی تھے، وہ اپنی بیوی سے رسمی اطاعت اور خدمت گزاری کی بجائے محبت اور ہمدردی کی توقع رکھتے تھے۔ وہ ان سے صرف محبت ہی نہ کرتے تھے ان پر نازاں تھے۔ ان کے ہاں دو بچیاں ہوئیں اور شیر خواری میں ہی ختم ہوگئیں۔ ان صدموں میں سخاوت کی محبت اور خیال نے رقیہ کو سہارا دیے رکھا۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہی سخاوت کا تبادلہ رنگ پور سے بھاگلپور ہوگیا۔ انہوں نے رقیہ کو حوصلہ دیا کہ وہ بھاگلپور میں اپنی جیسی عورتوں سے میل جول بڑھائیں۔ اپنی ہم مرتبہ تعلیم یافتہ ہندو اور عیسائی خواتین سے میل جول نے رقیہ کو یہ اعتبار دیا کہ اگر عورتوں کو موقعہ دیا جائے تو وہ تنہائی اور قید کی زندگی کے مقابلے میں کہیں بہتر زندگی گزار سکتی ہیں۔ ان کی کئی واقف کار شدھا

مزمدار کی طرح کی ہوں گی۔ رقیہ کی ایک ہندو ہم عصر، دونوں کی زندگی میں بڑی مماثلت ملتی ہے لیکن دونوں ایک دوسرے سے شناسا نہ تھیں۔ ان خاتون کی یادداشتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خواتین اپنی خوش نصیب حیثیت سے بخوبی واقف تھیں اور اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ بھی۔ فلاح کے کارخیر میں ان کی شرکت اور شمولیت کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس پر مستزاد رقیہ کا ایسی انگریزی کتابوں کا مطالعہ جس میں زندگی کی ایک اور متبادل کیفیت موجود تھی۔ ان سب نے بنگالی عورتوں کی سختی اور مجبوری کی زندگی کے بارے میں رقیہ کے شعور کی بہت تراش خراش کی۔ رقیہ کو اس بات کا احساس تھا کہ پدری معاشروں میں مرد عورتوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان پر اور جبر کرتے ہیں لیکن ان کی فوری توجہ ان عورتوں کی زندگی پر تھی جو ان کے اپنے طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ سخاوت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کی ان غیر رسمی موضوعات پر لکھنے اور شائع کرانے کی حوصلہ افزائی کی۔ ''اگر میرے عزیز شوہر اس طرح میرا اسہارا نہ بنتے تو میں تو شاید کبھی کچھ نہ لکھ سکتی اور نہ چھپوا سکتی۔''

رقیہ کی خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ بہت سے سماجی مسئلوں پر سخاوت اور ان کے خیالات میں بڑے کمال کی مطابقت تھی۔ سخاوت کے ایک گہرے دوست اور کلاس فیلو مکندر یومکھوپادیا (جو کہ مشہور ہندی ادیب اور استاد بھود یومکھوپادیا کے بیٹے تھے) نے یوں ذکر کیا ہے، ''وہ چونکہ خود ایک تعلیم یافتہ بیوی کے ساتھ کا لطف اٹھا رہے تھے اس لئے عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بہت مخلص تھے۔'' بہرحال، رقیہ کے مقدر میں سخاوت کا زیادہ ساتھ نہ تھا۔ سخاوت ذیابیطس کے مریض تھے۔ ۱۹۰۷ء تک ان کی صحت بہت بگڑ گئی اور بینائی بہت کم ہوگئی۔ رقیہ نے ان کی بے طرح خدمت کی اور ان کی تمام ذاتی اور سرکاری خط وکتابت میں ان کی مدد کی۔ یہ سب خط وکتابت انگریزی میں ہوتی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سخاوت علاج کے لئے کلکتہ گئے۔ ۳مئی کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اپنے انتقال سے پہلے ہی انہوں نے رقیہ کے قانونی حصہ کے علاوہ عورتوں کی تعلیم کے لئے اپنے سرمائے سے ایک خطیر رقم بھی وصیت کر دی تھی۔

اسی سال رقیہ نے بڑی وفاداری سے اپنے شوہر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بھاگلپور میں لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا۔ سخاوت کی پہلی بیوی سے بیٹی کے شوہر نے اس بات پر حشر کھڑا کرڈالا کہ ایک تو رقیہ کو سخاوت کے سرمائے سے حصہ ملا اوراس پر بڑھ کر یہ کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر خرچ کی جائے۔ رقیہ جیسی حوصلے والی صابر خاتون کے لئے بھی ان حضرت کی کمینگی قابل برداشت نہ رہی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ بھاگلپور سے کلکتہ چلی گئیں لیکن انہوں نے خاندان سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کئے۔ کلکتہ میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہنے لگیں جن کا انتقال کچھ عرصے بعد ہی ہوگیا۔ رقیہ کی چھوٹی بیوہ بہن حمیرا چودھری ان کی ساتھی بن گئیں۔ ۱۹۱۱ء میں رقیہ نے کلکتہ میں ۸ ولی اللہ لین پر صرف آٹھ لڑکیوں کی تعداد سے سخاوت میموریل گرلز ہائی اسکول کھولا۔ یہ اسکول ابھی تک قائم ہے، ان کے بے مثال شوہر کی قابل ایک موزوں یادگار اور خود رقیہ کے لئے بھی۔

خود آموختہ اور پردے کی پابندی میں پلی بڑھی رقیہ کو کلاس روم کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ چند دنوں تک ان کی سمجھ میں یہ ہی نہ آپایا کہ ایک استاد بیک وقت بہت ساری شاگردوں کو کس طرح پڑھا سکتی ہے۔ اپنی مخصوص قوت ارادی کے بل بوتے پر رقیہ نے تدریسی اور انتظامی امور کے طریقے سیکھنا شروع کئے۔ کلکتہ میں انہوں نے برہمو اور ہندو لڑکیوں کے اسکولوں میں جانا شروع کیا۔ وہاں کی پرنسپلوں سے شناسائی حاصل کی اور یوں مشاہدے کے حوالے سے اسکول کا نظم و نسق چلانا سیکھا۔

روایت پسندوں کی شدید مخالفت کے باوجود رقیہ کی انتھک محنت اور اپنے مقصد سے سپردگی رنگ لائی اور آہستہ آہستہ شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۱۵ء کے آخر تک کلکتہ میں اسکول کھلنے کے چار سال بعد شاگردوں کی تعداد آٹھ سے بڑھ کر چوراسی ہوگئی۔ اب اسکول ایک بڑی عمارت 86/A لوئر سرکلر روڈ میں منتقل ہوگیا۔ دو تین استانیاں اور تھیں۔ اسکول کو سہولت سے چلانے کے لئے رقیہ مشین کی طرح کام کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی ایک عم زاد کو لکھا، ''مجھے ذرہ بھر فرصت نہیں ملتی۔ اللہ کے کرم سے اس وقت ہمارے پاس پانچ جماعتوں میں ستر شاگرد

ہیں۔(اس وقت تک اسکول پرائمری تک تھا) دوگھوڑا گاڑیاں۔ مجھے ہر چیز پر نظر رکھنا ہوتی ہے۔ اس بات تک کی بھی فکر کرنا میرا حصہ ہے کہ روزانہ شام کو گھوڑوں کو کھریرا کیا گیا یا نہیں۔ اور تم جانو میرا معاشرہ مجھے اس کا کیا انعام دیتا ہے؟ میری قوم میری معمولی سی غلطی ڈھونڈھنے میں مصروف رہتی ہے۔''

پردے کے معاملے میں رقیہ کا عمل بے حد متوازن اور معتدل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسکول بس کی پردہ داری کر کے وہ بنیاد پرستوں کی تنقید اور مخالفت کو بڑی حد تک کم کریں گی۔ تجرباتی طور پر اسکول بس چلانے کے سلسلے میں رقیہ اور اسکول دونوں کو جس کربناک امتحان سے گزرنا پڑا ''عزلت نشین'' کی رپورٹ ۴۷ اس کی بین گواہی ہے۔(اس مجموعہ میں یہ شامل ہے)۔ ان کے مخالف ان کے مرتے دم تک سرگرم عمل رہے۔ ان کے پاس یقین اور اعتماد کا ایسا حوصلہ تھا جس سے پہاڑ ہٹائے جاسکتے ہیں۔ مالی امداد کے لئے رقیہ کی تمام درخواستیں کلکتہ کے امیر باثر مسلمانوں کی بے اعتنائی سے رد کردی جاتیں مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ۱۹۳۰ء تک یہ اسکول ہائی اسکول ہوچکا تھا اور یہاں دسوں جماعتوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ یہاں کے نصاب میں صحت وجسمانی تعلیم، دستکاری، سینا پرونا، کھانا پکانا، نرسنگ، معاشیات خانہ داری اور باغبانی جیسے مضامین شامل تھے۔ یہ زبانوں کے دستوری نصاب جیسے بنگالی، انگریزی، اردو اور فارسی کے علاوہ تھے۔ انہوں نے اس بات پر بہت زیادہ توجہ دی کہ لڑکیوں کو کسی نہ کسی ہنر کی تعلیم دی جائے تا کہ وہ اپنے خاندانوں کی آمدنی پر بوجھ بننے کی بجائے خود ایک سرمایہ بن سکیں۔

باثر مردوں کی مخالفت نے رقیہ کو اس بات کا شعور دیا کہ عورتوں کو منظم کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ صرف منظّم کوشش کے ذریعے عورتوں کی تعلیم کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے ایک تنہا فرد کی کوشش کے مقابلے میں متحدہ کوشش ہی بارآور ہوسکتی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے انجمن خواتین اسلام کی بنیاد ڈالی۔ گھر گھر جا کر انہوں نے خواتین کو ممبر بننے پر آمادہ کیا۔ اس میں انہیں بہت طعنے تشنے سہنے

پڑے لیکن ان کے ارادے کی پختگی اور اپنے مقصد سے لگن پھر جیت گئی۔

انجمن کی روح رواں کی حیثیت سے انہوں نے جس طرح کے کام اپنے ذمے لئے اس کے نتیجہ میں غریب طبقہ کی عورتوں سے ان کا براہ راست سابقہ پڑا۔ ان کا اسکول اور ان کی تحریروں کا دائرۂ عمل امیر اور متوسط طبقہ تک تھا۔ آج کل ان کے اس ابتدائی رویے پر کافی تنقید کی گئی ہے لیکن انجمن غریب بیواؤں کو مالی امداد دیتی، پریشان حال مظلوم بیویوں کو تحفظ اور پناہ مہیا کرتی، غریب گھرانوں کی بچیوں کے بیاہ شادی کا انتظام کرتی اور سب سے بڑھ کر غریب عورتوں کو خواندگی کے مواقع دیتی۔ رقیہ کو اپنے وقت کے بنگال میں رسمی تعلیم کی اعزازی حیثیت کا پوری طرح احساس تھا۔ یہ بات ان پر واضح تھی کہ غریب عورتوں کی غربت انہیں تعلیم حاصل کرنے سے مجبور رکھتی ہے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کی انجمن نے کلکتہ کی کچی بستیوں اور جھونپڑیوں میں رہنے والی ہندو اور مسلمان عورتوں کے لئے خواندگی کا ایک باقاعدہ پروگرام منظّم کیا۔ کلکتہ میں پھیلی ہوئی ان کچی آبادیوں تک رسائی کے لئے انجمن کی ممبروں نے ٹیمیں بنائیں تاکہ ان آبادیوں میں گھر گھر جا کر عورتوں کو عام معمولی لکھنا پڑھنا، حفظان صحت اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا سکھا سکیں۔ ذریعہ تعلیم مکینوں کی زبان کے مطابق بنگالی یا اردو ہوتا، اس کار خیر میں سخاوت اسکول سے فارغ التحصیل بہت سی شاگردوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور وہ آج تک رقیہ کے حوصلہ، قوت، ارادے اور ان کی متاثر کن شخصیت کو محبت سے یاد کرتی ہیں۔

۱۹۳۲ء میں اپنی وفات تک بنگالی مسلمان عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے لئے اپنی تحریروں کے حوالے سے، اپنے اسکول سے اور اپنی انجمن کے ذریعے تن من دھن سے کوشاں رہیں۔ اگر ان کی تحریروں کا اس معاشرتی پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو شاید ہم پر یہ بات کھل سکے کہ ان کی تمام کوششیں کس بات کے حصول کے لئے تھیں۔

رقعہ کی ادبی سرگرمیاں تین دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۲ء تک ان کی تمام تحریریں بالخصوص ان کے مضامین چند موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن کا آپس میں گہرا رشتہ

ہے۔

۱۔ عورتوں اور خاص طور پر بنگالی مسلمان عورت کی حالت۔

۲۔ بنگالی مسلمان اور اس کے مسائل اور

۳۔ بنگالی معاشرہ اور اس کے مسائل۔

عورتیں رقیہ کی فکر کا محور اور مرکز ہیں یعنی عورتوں میں شعور کی بیداری اور عورتوں کے لئے منصفانہ حقوق اور سماجی مرتبے کی یقین دہانی۔ اس کے ساتھ ساتھ رقیہ بنگال کے مسلم معاشرے کے لئے بھی اتنی ہی فکر مند تھیں اور عورتیں جس کا لازمی حصہ تھیں۔ اسی طرح رقیہ کا شعور بنگال کے پورے معاشرے کی سطح کا بھی ادراک رکھتا تھا۔ بنگالی مسلمان اس معاشرے کا لازمی حصہ تھے۔ وہ اپنے مسلمان معاشرے سے بددل اور غیر مطمئن ہونے کے باوجود ان کی ترقی کے لئے دردمندی سے کوشاں تھیں۔ ان کا نقطۂ نظر اپنی دوسری ہندو مسلمان ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھیں۔ بنگالی ادب میں ایسی آزاد خیالی خال خال ہی ملتی ہے۔ رقیہ کا دامن خیال صرف بنگال تک ہی محدود نہ تھا۔ ہندوستان کی عورتوں کی عمومی صورتحال ان کو تعلق تھا بلکہ دوسرے ملکوں کی عورتوں کے حال سے بھی وہ بیگانہ نہ تھیں۔ بنگالی ادیبوں کے یہاں ایسا وسیع عالمی نظریہ بھی شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔

اپنے وقت کی دوسری مسلمان لکھنے والیوں کی طرح رقیہ کو بھی اپنے معاشرے کا خیال خصوصی طور پر تھا۔ انیسویں صدی کی آخری تین دہائیاں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے دباؤ اور تبدیلی کا عرصہ تھیں۔ یہ اس احساس کا نتیجہ تھا کہ ان کا مقابلہ دو طاقت ور قوتوں سے تھا۔ انگریزی بولنے والے عیسائی، ایک اجنبی ثقافت کے نمائندے تھے اور ان کے پاس سیاسی اختیار کے ساتھ ساتھ سماجی اور ثقافتی طور پر طریقوں کا نعم البدل بھی تھا۔ مغلوں سے انگریز راج کو اقتدار کی منتقلی کا فوری ردعمل ہندوؤں نے ظاہر کیا۔ انگریزی زبان سیکھنے میں تیزی کے ساتھ ساتھ وہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں بھی مستعد تھے تاکہ انتظامی اور سیاسی اختیار میں شریک ہوسکیں۔ اس

صورتحال سے سامراجی حکمرانوں کی خوشنودی اور سرپرستی بھی منظور تھی۔ جدت پسندوں اور روایت شعاروں میں ایک طویل مباحثہ کے بعد ۱۸۷۰ء تک فیصلہ جدت پسندوں کے حق میں ہو چکا تھا۔ اس وقت تک ہندوؤں کی اتنی حیثیت ہو چکی تھی کہ وہ بہت سے ایسے سماجی مسائل کا حل تلاش کر سکیں جو تمام بنگالی معاشرے میں مشترک تھے۔

دوسری طرف مسلمان بھی اپنی زندگی کا بامعنی جواز تلاش کرنے کے عمل میں جدت اور روایت کے رویوں کی کشمکش میں تقسیم تھے۔ ایک نمائندہ گروپ کی حیثیت سے بقا کا خیال اور ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے شناخت مسلمانوں کو مدافعتی رویوں پر مجبور رکھتی تھی جس کی وجہ سے ان کی قدامت پسندی اور بھی شدید ہو جاتی۔ علی گڑھ والے سرسید احمد خان (جنہیں ہندو مصلح قوم راجہ رام موہن رائے کا متوازی سمجھا جاتا تھا۔) مغربی علوم کو حاصل کرنے کے حق میں تھے اور اس سے اسلام کی بنیادی قدروں کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ انہوں نے بنگال کے مسلمان راہنماؤں جیسے نواب عبداللطیف (۱۸۹۳۔۱۸۲۸) اور کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی کے دوسرے ممبروں کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کو ہندوؤں سے مقابلے کی خاطر جدید تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کی مدبرانہ کوششوں کی بدولت بنگال کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں صرف ۱۔۱۴ فی صد مسلمان بچے اسکولوں میں داخل تھے اور صرف دس سال کے عرصہ میں یعنی ۱۸۸۱ء تک یہ تناسب ۸۔۲۳ فی صد تک پہنچ چکا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر تک بنگالی مسلمانوں کو اس بات نے متحد کر دیا تھا کہ وہ سب ایک قوم کی حیثیت سے اپنی شناخت کے خواہاں تھے۔ اس سنجیدہ خیالی نے ایک طرف تو انہیں تاریخ اور روایت کے حوالے سے اپنے ورثہ کی پہچان کے لئے آمادہ کیا اور دوسری طرف ان کی اپنی موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرنے کا شعور پیدا کیا۔ اس سلسلے میں لطف کی بات یہ ہے کہ بنگالی عورتوں کی حیثیت کے معاملے میں تمام غور وفکر اور بحث وتمحیص اس وقت تک خاموش تھی جب تک کہ رقیہ

نے اس مسئلے کو نہ اٹھایا۔ انیسویں صدی کے ہندو اور مسلمانوں کے تشخص کے سوال پر یہ خاموشی سب سے زیادہ نمایاں فرق ہے۔ ہندو روایت پسندوں اور روشن خیال علمبرداروں کی شدید بحث میں جو موضوعات سب سے زیادہ شدت بلکہ جذباتی حد تک تکرار کا باعث بنے ان کا تعلق خاندانی زندگی اور عورتوں کی حیثیت سے تھا۔ کم سنی کی شادی، ایک سے زیادہ شادیاں، بیواؤں کی دوبارہ شادی، پردہ اور عورتوں کی تعلیم اس اختلاف کے دہکتے انگارے تھے۔

ان روشن خیالوں کی تحریکوں کی وجہ سے ۱۸۵۶ء میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کی اجازت کا ایکٹ پاس ہوا۔ ایک سے زیادہ شادیوں کی روایت ختم ہونے لگی۔ ۱۸۹۱ء میں شادی کے لئے بارہ سال کی کم سے کم عمر کا قانون بنا۔ ۱۸۹۶ء میں برہمو سماج عورتوں کو پردہ سے باہر آنے اور ہفتہ وار جلسوں میں شرکت کی اجازت ملی۔ ۱۸۶۳ء میں لڑکیوں کے صرف پچانوے اسکول تھے۔ ۱۸۹۱ء میں ان کی تعداد ۲۲۳۸ ہوگئی۔ اسکول جانے والی بچیوں کی تعداد ۱۸۶۳ میں ۲۴۸۶ تھی اور ۱۸۹۱ میں ۸۶۵۔۸۷ ہوگئی۔ یہ تمام بچیاں ہندو، برہمو یا عیسائی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہندو اور برہمو مردوں کی نوجوان نسل اپنی شریک زندگی کے لئے تعلیم یافتہ ہونے پر اصرار کرتے تھے۔ اس صورتحال نے قدامت پسند امرا اور متوسط خاندانوں کو اپنی بچیوں کو اسکول بھیجنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۰۵ء میں جن عورتوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کی تھیں ان کی تعداد ۳۰ تھی۔ یہ سب ہندو، برہمو یا عیسائی تھیں۔ ان میں ایک بھی مسلمان خاتون نہ تھی۔ جہاں تک لڑکوں کی تعلیم کا تعلق تھا مسلمان اس معاملے میں ہندوؤں کی تقلید میں ان کے برابر آنے بلکہ ان سے آگے نکلنے میں حد سے زیادہ کوشاں تھے لیکن لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں ان کی تقلید کرنے میں اتنا پس و پیش کیوں تھا؟ اس کی وجہ شاید پردے کی سختی سے پابندی کے معاملے میں ان کا رویہ تھا۔

مسلمانوں کے لئے پردے کے اصولوں میں لچک کا سوال ایک بڑا سنجیدہ معاملہ تھا۔ قرآن اور حدیث کے احکامات اس معاملے میں موجود ہیں۔ چوبیسویں سورت میں عورتوں کے

لئے ایسے رویے کی ہدایت ہے جو بے ادعا اور منکسر ہو۔ ان کے لئے نظریں نیچی رکھنے اور صرف اپنے محرموں کے سامنے بے تکلف اور بے حجاب ہونے کا حکم ہے۔ سر اور سینہ کو ڈھانپنا، شوخ و شنگ زیورات تک پہننے سے اجتناب کرنا ان کے لئے لازم ہے تا کہ وہ توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کر سکیں۔ بعد میں کی جانے والی تشریحوں اور وضاحتوں میں عورتوں کی حرکت و عمل پر پابندی لگانے اور منفی طور پر ان کی اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہ رکھنے پر توجہ مرکوز ہوگئی۔

فاطمہ مرینیسی، پردے کی پابندی کی شدت کے سلسلے میں اس دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ مرد عورتوں کی ترغیب سے اس طرح وارفتہ ہو جاتے کہ ان کے دل سے اپنے مالک اپنے رب کا خیال بھی محو ہو جاتا۔ عبودیت کے اس انحراف سے امت میں وہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا جس کا خیال لوگوں کو ہمیشہ خوفزدہ کئے رہا اور امت میں صرف مرد ہی شامل ہیں۔ کیونکہ اسلام میں مردوں کو برتری حاصل ہے۔ اس فتنہ کا خوف ایک طرف اور دوسری طرف حسب نسب کے معاملے میں اضطراب نے، مسلمان مردوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ عورتوں کے حرکت و عمل اور اپنے متعلق فیصلہ کرنے کی قوت کو محدود سے محدود تر کر دیں۔ جس زمانے میں رقیہ تھیں اس وقت پردے کی بدولت مرد اور عورتوں کے آپس میں ملنے جلنے کے چند ہی مواقع تھے۔ خانگی زندگی میں بھی عورتوں اور مردوں کی اپنی اپنی حدیں تھیں اور ان کی نگرانی کے اصول سخت تھے۔

بنگال کے مسلمانوں اور خاص طور پر امراء کے طبقہ میں پردے کی سختی کی ایک سماجی اور اقتصادی وجہ بھی تھی۔ پردے کی سختی سے پابندی کی وجہ سے ایک طرف تو عورتوں کو زنان خانے کی علیحدہ زندگی میسر تھی اور دوسرے گھر سے باہر کی زندگی میں بھی ان کی پوشیدگی برقعہ اور باپردہ سواریوں کی بدولت یقینی تھی۔ اس سارے انتظام کو اچھے خاصے اخراجات کی ضرورت تھی اور صرف امیر ہی اس بوجھ کو اٹھا سکتے تھے۔ اس طرح پردہ، رتبہ اور حیثیت کی علامت بن گیا۔ اسی رتبہ اور حیثیت کے خیال نے اونچے طبقہ کے لڑکوں کو ترقی پسند اسکولوں میں جانے کا راستہ ہموار کیا اور یہی خیال رقیہ کے زمانے کی لڑکیوں کے راستے کا پتھر بن گیا۔

اونچے طبقہ کے مسلمانوں میں یہ تہذیبی اور فکری خلیج مردوں اور عورتوں کے درمیان گہری سے گہری ہوتی گئی لیکن مسلمان مرد اس معاملے میں کچھ فکرمند نہ تھے۔ نہ ہی ہندو اور برہمو عورتوں کی حیثیت اور مقام میں تعلیم کی بدولت جو تبدیلی آئی، اس سے مسلمان مردوں کو کچھ تشویش تھی۔ مسلمان عورتوں کی کم تر حیثیت پر اس تہذیبی محرومی کے جو منفی اثرات مرتب ہوئے، رقیہ کو ان کا بخوبی اندازہ تھا۔

۴۔۱۹۰۳ میں رقیہ کے جو پانچ مضامین چھپے، ''عورتوں کی زبوں حالی'' ادھوری عورت'' ''سلیقہ شعار بیوی'' ''برقعہ'' اور ''گھر'' ان کو پردے کے متعلق ان کی اولیں رائے کہا جاسکتا ہے۔ ان کی بعد کی تصانیف میں ان مضامین کے مرکزی خیال کی توضیح اور توثیق ملتی ہے۔ ان مضامین کا مجموعہ ۱۹۰۸ء میں کتابی شکل ''موتی چور'' میں چھپا۔ یہ مضامین رقیہ کی اس فکر اور تدبر کا اظہار ہیں جو عورتوں کے مقدمہ کی وکیل کی حیثیت سے ان کا وظیفہ تھا، رقیہ کے دلائل کچھ یوں تھے:

۱۔ گوکہ عورتیں اس وقت معاشی طور پر مردوں کی دست نگر ہیں جس کی وجوہات تاریخی ہیں لیکن فطرتاً وہ مردوں سے ذہنی اور روحانی طور پر کم تر نہیں ہیں اگر انہیں بھی مساوی مواقع میسر ہوں تو وہ خود کو ذہنی اور روحانی خوبیوں میں مردوں کے ہم پلہ ثابت کر سکتی ہیں۔

۲۔ عورتوں کو گھر کی چار دیواری تک مقید کر کے مرد جان بوجھ کر عورتوں کو ذہنی ترقی اور سودمند مصروفیتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی دست نگر اور کم حیثیت بنا دیا جاتا ہے۔

۳۔ عورتوں پر اپنی برتری کو دوام بخشنے کے لئے مرد معاشرتی اختیار کی تمام ترکیبوں کو کام میں لاتے ہیں۔ ان میں سرفہرست بات یہ ہے کہ عورتوں کو پابند کیا جائے اور ان کے معاشرتی عمل کو محدود کر دیا جائے۔

MashalBooks.org

۴۔ مرد اپنے بنائے ہوئے قوانین میں اس چابک دستی سے جوڑ توڑ کر لیتے ہیں کہ عورتیں اپنے قانونی حقوق سے بھی محروم رہ جاتی ہیں۔ اس معاملے میں وہ عورتوں کی جہالت اور عدم تحفظ کے احساس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۵۔ معاشرے کے آدھے حصہ کو جان بوجھ کر صحت مند فطری نشوونما سے مجبور کر دینا ایک غیر منصفانہ اور غیر اخلاقی طریقہ کار ہے۔ اس کا نقصان پورے معاشرے کو ہوتا ہے۔

۶۔ ان پابندیوں نے عورتوں کو جسمانی طور پر کمزور، جاہل اور عقل میں ناقص بنا دیا ہے۔ اس طرح انہیں معاشرتی طور پر قابل قبول، ماں اور بیوی کی حیثیت سے ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اہل بھی نہیں رہنے دیا جاتا۔

۷۔ اس افسوناک صورتحال کی درستی کا موثر اور اخلاقی طریقہ یہی ہے کہ عورتوں کے لئے تعلیم کے مواقع مہیا کئے جائیں اور اسے پردے کی پابندی سے آزاد ہونے سے مشروط کر دیا جائے۔

۸۔ نتیجہ کے طور پر مردوں سمیت معاشرے کو اس سے بے انتہا فائدہ ہوگا کیونکہ تعلیم یافتہ عورتیں معاشرے کے لئے خود کو ذمہ دار اور مفید سمجھنے لگیں گی۔

عورتوں کی وکالت کے معاملے میں چند خصوصیات رقیہ کو دوسروں سے الگ کرتی ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ وہ ایک مسلمان عورت ہیں۔ عورتوں کے حق میں آواز اٹھانے والے ان کے ہم عصر راجہ رام موہن رائے برہمو تھے اور دوسرے ایشور چندر ودیا ساگر ہندو اور پھر دونوں مرد۔ رقیہ کے لہجے میں ان دونوں سے زیادہ شدت اور خفگی تھی۔ رائے اور ودیا ساگر کو ٹیگور جیسی معتبر مصلح شخصیت کی حمایت میسر تھی۔ ٹیگور خاندان کی خواتین نے اس معاملے میں اپنی آواز شامل کرنے میں پیش قدمی کی اور دوسری خواتین کے لئے مثال قائم کی۔ رقیہ کو اپنے لئے ایک مدت تک راہ ہموار کرنا پڑی تب کہیں جا کے اپنے معاشرے کے صاحب رسوخ لوگوں کی حمایت انہیں حاصل ہو سکی۔ سب سے اہم اور آخری فرق رقیہ اور دوسرے حامیوں کے درمیان یہ ہے کہ انہوں

نے مرد کی برتری کے مسلمہ تصور کو چیلنج کیا۔

اپنے زاویہ فکر کی پیروی میں رقیہ پر یہ بات واضح تھی کہ انہیں روایت پسندوں کی دلیلوں کا توڑ کرنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ خود عورتوں میں یہ بھی شعور بیدار کرنا پڑے گا کہ انہیں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اپنی ساری کوفت کے باوجود رقیہ نے اپنے آپ کو شاذ ہی جذبات سے مغلوب ہونے دیا۔ ان کے منطقی ذہن اور رائے عامہ کو بھانپنے کی غیر معمولی صلاحیت نے انہیں اس بات کا احساس دلایا کہ اس صورتحال کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری عورتوں پر بھی ہے کہ وہ جبر کو خاموشی سے برداشت کرتی ہیں اور ظلم کو اپنے اوپر روا رکھتی ہیں۔

رقیہ اس بات سے بخوبی واقف تھیں کہ روایت پسندوں کے پاس مرد کی برتری کے تصور کے لئے مذہبی کتابوں کے حوالے موجود تھے جیسے اسلام، عیسائیت اور یہودیت میں تخلیق آدم کا مشترک تصور اور ہندو روایت میں منو کی تحریریں جو مرد کو عورت کا نگران ٹھہراتی ہیں۔ منو کی تحریروں کے مطابق ایک عورت کبھی بھی اپنی زندگی خود نہیں گزار سکتی، بچپن میں باپ، جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں بیٹا اس کے قانونی ولی ہیں۔

اسلام کے قانون شہادت کے لئے، جہاں دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں، رقیہ کا یہ کہنا تھا: ''اگر پروردگار کو عورتوں کو کم تر تخلیق کرنا متصور ہوتا تو وہ مقرر کرتا کہ مائیں بیٹیوں کو پانچ مہینہ کے حمل کے بعد جنم دے دیں۔ رضاعت کا عرصہ بھی بیٹوں کے مقابلے میں آدھا ہوتا لیکن قانون قدرت ایسا تو نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کیا پروردگار منصف اور انتہائی کریم نہیں ہے؟ انہوں نے اپنی بات یوں ختم کی۔ ''مرد مذہب کو ہم عورتوں پر بالادستی کے لئے ایک حیلے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، اس لئے ہمیں اس زیادتی کو مذہب کے نام پر برداشت نہیں کرنا چاہیے۔'' یہ کہنے کے لئے رقیہ کو بڑے حوصلے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ ایک ایسے قانونی نکتہ پر سوال اٹھا رہی تھیں جس کی اساس قرآن کے متن پر تھی۔ مسلمان عالم اور فقیہ حدیث کی صحت اور درستی پر تو بحث کرنے سے نہیں ہچکچاتے مگر کوئی ایسا ہو گا جو یہ جرأت

کر سکے کہ قرآن کے متن پر سوال اٹھائے جس کے لئے شرط ہے کہ بلا حیل و حجت قبول کرنا چاہیے۔

روایت پرست عورتوں کی تعلیم کے خلاف دلیل یوں دیتے تھے: مردوں کو اسکول جانا چاہیے، انگریزی سیکھیں، ڈگری حاصل کریں تاکہ انہیں ملازمت مل سکے اور وہ اپنے خاندانوں کی کفالت کر سکیں۔ عورتوں کو تو گھر میں رہنا ہے تاکہ خانہ داری کا کاروبار سنبھالیں۔ وہ مردوں کے زیر کفالت ہیں اس لئے ان کے لئے تعلیم بے کار ہے۔ رقیہ کے ذہن میں تعلیم کے مقاصد اور نوعیت کے متعلق بالکل اور ہی خاکہ تھا۔ ان کے خیال میں تعلیم کی تعریف اس طرح تھی۔ ''خداداد صلاحیتوں کے ارتقاء اور ترقی کے لئے ان صلاحیتوں کا باقاعدہ استعمال، صرف امتحان پاس کرنے اور ڈگری حاصل کر لینے کو ہماری رائے میں تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔'' تعلیم کی منزل صرف ملازمت کا حصول نہیں ہے۔ صنف سے قطع نظر انسانوں کے لئے تعلیم کا منتہائے مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کا شعور پیدا کریں تاکہ انسانوں کی حیثیت سے وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں۔ اس لئے تعلیم پر عورتوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مردوں کا۔

اس تعلیم سے عورتوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ رقیہ کے خیال میں مناسب تعلیم سے عورتیں ''ادب اور سائنس کے مختلف شعبوں کے متعلق علم حاصل کر سکیں گی۔ انہیں اپنے ملک سے محبت کرنا آئے گی، اس میں جسمانی تعلیم و تربیت بھی شامل ہوگی تاکہ وہ کمزور اور ناتواں نہ رہ جائیں۔ ان کی ایسی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے گی کہ وہ معاشی لحاظ سے مردوں کی محتاج نہ رہیں۔'' انہوں نے بار بار اس ضرورت کی اہمیت پر زور دیا کہ عورتوں کو کیمسٹری، باٹنی، باغبانی، صفائی ستھرائی، حفظان صحت، غذائیت، جسمانی تعلیم، کھیل، پینٹنگ اور دوسرے فنون لطیفہ کی تعلیم دینا چاہیے۔ بنگال کے تمام اصلاح کرنے والوں میں سے رقیہ واحد وہ عورت ہیں جن کے ذہن میں یہ بات صاف واضح تھی کہ معاشی خودمختاری عورتوں کی آزادی کے لئے پہلی شرط ہے۔ انہوں نے لکھا: ''کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے ہاتھوں ظلم اور زیادتی برداشت اسی لئے کرتی ہیں کہ وہ

معاشی لحاظ سے ان کی محتاج ہوتی ہیں، وہ صحیح کہتے ہیں۔'' انہوں نے رائے دی کہ عورتیں کام کرنا شروع کر دیں۔ ''اگر مردوں کے جبر سے آزادی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم خود روزگار پیدا کر سکیں تو پھر ہمیں ایسا کرنا شروع کر دینا چاہیے۔'' ہمیں وکیل، مجسٹریٹ، جج، کلرک بننا چاہیے۔ جس طرح کا کام ہم اپنے گھروں میں کرتی ہیں اگر یہ ہی باہر کرنے لگیں تو اس سے بھی اجرت مل سکتی ہے۔ متوسط طبقہ کی ان ملازمتوں سے آگے بڑھ کر بھی رقیہ کی نظر گئی۔ انہوں نے لکھا: ''ان ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں ان مواقع کے لئے بھی سوچنا چاہیے جن کا تعلق زراعت سے ہے۔''

رقیہ کو اس بات کا علم تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے عورتوں کو پردے کی پابندی سے باہر آنا پڑے گا۔ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ پردے کی پابندی کا ختم ہونا آزادی ملنے کی شرط نہیں ہے۔ وہ یہ بات سمجھ رہی تھیں کہ برقعہ کے بغیر ہو کر بھی عورت آزاد نہیں ہوگی۔ وہ آزاد تو حقیقت میں اسی وقت ہوں گی جب وہ اپنے متعلق سوچنے اور فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوں گی، رقیہ نے اس طرح مثال دی:

''حال ہی میں پارسی عورتوں نے بغیر پردے کے باہر نکلنا شروع کیا ہے، مگر کیا وہ واقعی ذہنی غلامی سے آزاد ہیں؟ قطعی نہیں۔ ان کا بے پردہ ہونا بھی ان کے اپنے کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں ہے۔ پارسی مرد، مغرب کی اندھی تقلید میں اپنی عورتوں کو باہر گھسیٹ لائے ہیں۔ اس سے ان کی عورتوں کی منشاء اور رضا ظاہر نہیں ہوتی، وہ اسی طرح بے اختیار ہیں، جس طرح پہلے تھیں۔ جب ان کے مردوں نے انہیں پردے کا پابند رکھا، وہ رہیں۔ جب مرد انہیں نتھ سے کھینچ کر باہر لے آئے، وہ باہر آ گئیں۔ اسے ہم عورتوں کی کامیابی کسی طرح نہیں کہہ سکتے؟''

رقیہ کے خیال میں یہ ذہنی غلامی مردوں کے مسلسل جبر کا سب سے نقصان دہ پہلو تھا۔ ایک ایسے نظام میں جہاں دلیل کی گنجائش نہ ہو، عورتوں کی یہ صلاحیت لازمی طور پر اپنی موت آپ مر جائے گی۔ یہ ذہنی کیفیت ذہنی غلامی کو جاری رکھے گی۔ رقیہ نے اس کیفیت کا مقابلہ نشہ کی حالت

سے کیا۔ ''عادتیں کس قدر پختہ ہوتی ہیں۔ہم غلامی کے تمغوں (زیورات) کی ایسے ہی تمنا کرتی ہیں کیونکہ ہم ان کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں جس طرح ایک شرابی نشہ کا! آپ کے زیورات جن پر آپ کو ایسا ناز ہے، غلامی کے تمغوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ قیدی لوہے کی بنی ہتھکڑیاں پہنتے ہیں، ہم سونے یا چاندی کے کڑے پہنتی ہیں۔ جواہر جڑے گلو بند شاید کتے کے پٹے کی نقل ہیں۔''

عورتوں اور مردوں کے مابین رشتہ اور خاص طور پر ان کے شوہروں سے رقیہ کے خیال میں آقا اور غلام کا رشتہ ہے۔ چاہے مرد اس کے بیان کرنے کو کیسی ہی خوبصورت زبان کیوں نہ استعمال کریں۔ انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو یہ یاد دلایا کہ بنگالی زبان میں شوہر کو ''سوامی'' کہتے ہیں جس کے معنیٰ ''آقا'' کے ہیں۔ اپنے اس خیال کی وضاحت کے لئے انہوں نے رامائن کے قصہ میں سے رام اور سیتا کا حوالہ دیا۔

''رام کا تعلق سیتا سے بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچے کا اپنی من پسند گڑیا سے، ایک بچہ کو اپنا کھلونا بے حد پسند ہوسکتا ہے اگر کبھی وہ کھلونا اس کے پاس نہ ہو تو وہ اس کو بہت یاد کرسکتا ہے۔ اگر وہ چوری ہو جائے تو اسے چوری کرنے والے پر بہت غصہ آئے گا۔ جب اسے وہ واپس مل جائے تو وہ خوشی کے مارے پھولا نہیں نہ سمائے اور بلا وجہ اگلے لمحے وہ اسے کیچڑ میں پھینک سکتا ہے مگر وہ گڑیا کچھ بھی نہیں کرتی، وہ تو بے جان ہے۔ رامائن میں رام بھی کچھ ایسا ہی کرتا ہے اور سیتا کا سوامی ہوانے کی حیثیت کے اختیار کو بھرپور طریقے سے ظاہر کرتا ہے مگر سیتا؟ کیا رام نے کبھی ایسا برتاؤ بھی کیا جس سے یہ پتہ چلتا کہ سیتا کے اپنے بھی کوئی احساسات ہیں۔''

رقیہ کا پختہ خیال تھا کہ ایک تعلیم یافتہ آزاد خاتون کو اپنے شوہر کے برابر کا ساتھی ہونے کا حق حاصل ہے۔ ایسے گھر کا جہاں یہ مساوی تعلق موجود ہو انہوں نے ایک اچھی گاڑی سے تشبیہ دی جس کے دونوں پہیے ایک رفتار سے اطمینان کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں نہیں۔ اس زمانے کے پس منظر میں یہ تصور اس صورتحال سے کہیں بہتر تھا جو اس وقت کی ازدواجی زندگی میں موجود تھی۔ جہاں مرد اور عورت کے درمیان تعلیم اور تہذیبی فاصلہ

اتنا زیادہ تھا کہ ایک دوسرے کو سمجھنا ممکن ہی نہ تھا۔ انہوں نے مزاحاً ایک خاکہ یوں کھینچا:

''عزیز قاری، ذرا آئینہ میں اپنا عکس تو دیکھو آپ دائیں جانب مرد ہیں اور بائیں جانب عورت، آپ کا دایاں بازو تیس انچ لمبا ہے اور خوب توانا ہے۔ آپ کا دایاں بازو چوبیس انچ لمبا ہے اور لاغر۔ دایاں کندھا پانچ فٹ کی اونچائی پر اور بایاں چار فٹ تک پہنچتا ہے۔ اپنا یہ عکس آپ کو خود کیسا لگتا ہے؟''

عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کو رقیہ اس بات پر قائل کرنا چاہتی تھیں کہ عورتوں کی باقاعدہ رسمی تعلیم جدید گھرانوں کی زندگی کے لئے لازمی ہے۔ بدلتے ہوئے وقت کی رفتار کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایک خانہ دار خاتون کو اس سب کے سوا بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے جتنا اسے روایتی طور پر سکھایا جاتا ہے۔ اردو قاعدے کے چند صفحے، عام معمولی حساب اور اچار مربوں کی پانچ سوتر کیبیں، مگر غذائیت، غذا، بچوں کی نگہداشت یا نفسیات کا کوئی ذکر نہیں، باقی دوسرے مضامین تو ایک طرف رہے۔ ''ماں ہونے کے لئے تعلیم پہلی شرط ہے کیونکہ بچے کی پہلی اور انتہائی اہم استاد اور تربیت دینے والی ذات ماں کی ہوتی ہے۔'' یہ دلیل بڑی مانوس دلیل ہے جو رقیہ سے پہلے غیر مسلم بنگالی مصلحین استعمال کرتے رہے تھے اور یہ ہی دلیل ایسی دلیل تھی جسے رد کرنا روایت پسندوں کے لئے بھی آسان نہیں تھا۔ رقیہ کے ضمیر کی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ انتہائی خلوص سے انسانی کردار کی تشکیل میں ابتدائی ماحول کی اہمیت پر یقین رکھتی تھیں اور اس مرکزی کردار پر بھی جو اس تناظر میں ماں ادا کرتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر ان کے استدلال کے پیچھے ان کا تعین موجود تھا۔

رقیہ کو اس بات کے امکان کا اندازہ تھا کہ قدامت پسند انہیں باغی سمجھیں گے اور انہوں نے لکھا بھی ایک باغی کی طرح۔ لیکن انہوں نے شدید طریقۂ کار کی مخالفت کی۔ دراصل وہ پردے کی شدت کی مخالفت تھیں کیونکہ اس سے ایک مکمل انسان کی حیثیت سے عورتوں کی نشوونما میں اڑچن پڑتی تھیں کیونکہ اس سے ایک مکمل انسان کی حیثیت سے عورتوں کی نشوونما میں اڑچن

پڑتی تھی لیکن وہ پردے کی اصولی افادیت کے خلاف نہ تھیں جس کا تعلق حیا، لحاظ اور تمیز سے تھا۔ ان کی منطق یہ تھی، ''پردہ کرنا فطری نہیں ہے مگر اخلاقی ہے، جانور پردہ نہیں کرتے۔'' رقیہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ہجوم میں اپنی حفاظت کے طور پر پردہ تمام مہذب معاشروں میں موجود تھا۔ پردہ سے میری مراد یہ ہے کہ اچھی طرح ستر پوشی ہو نہ کہ مقید ہو کر رہا جائے۔ کس طرح کا پردہ ہونا چاہیے اس کا جواب ان کے پاس موجود تھا، ہم ضروری اور جائز پردہ قائم رکھیں گے۔ اس پردے سے عورتوں کے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔ لڑکیوں کے لئے علیحدہ اسکول اور خواتین اساتذہ کی مناسب تعداد سے ہم عورتوں کو تعلیم بھی دے سکتے ہیں اور پردے کی ایک مناسب حد تک پابندی بھی۔

اپنی پوری زندگی میں رقیہ خود جب باہر نکلتیں تو برقعہ اوڑھتیں، اپنے اسکولوں، دوستوں اور عزیز رشتہ داروں میں ان کا سر ہمیشہ ساڑھی کے پلو سے ڈھکا ہوتا۔ اس زمانے کی عام تعلیم یافتہ عورتوں کا یہی طریقہ تھا، بات عجیب لگتی ہے نا! بلکہ کسی حد تک متضاد بھی مگر نہیں۔ یہ ایک ایسی عورت کا عملی ردعمل تھا جس کی اپنے آئیڈیل سے وابستگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن جو زندگی کی حقیقتوں کے اعتراف کا بھی شعور رکھتی تھی شاید عورتوں کے حق میں آواز بلند کرنے میں وہ اسی لئے کامیاب رہیں۔

بنیادی طور پر وہ مسلمان عورتوں کی حیثیت اور مسئلوں سے زیادہ سرکار رکھتی تھیں لیکن معاشرے کے دوسرے طبقوں کی عورتوں پر ہونے والے استحصال اور ظلم سے بھی پوری طرح واقف تھیں۔ ''عزلت نشین'' میں اپنی رپورٹ میں انہوں نے ہندو عورتوں میں پردے کی رسم کا بھی ذکر کیا، اپنی دوسری ہندوستانی بہن کے برعکس انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ اپنی ظاہری آزادی کے باوجود مغرب کی عورتیں بھی مرد کے ستم کا شکار ہیں جس کی تائید ان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کرتے ہیں۔ وکٹورین عہد کی میری کوریلی کی ایک کہانی ''ڈیلیشیا کا قتل'' کے ترجمہ میں انہوں نے مغربی طرز زندگی کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ''افسوس قانون بھی ان کے ساتھ

مضبوط کرتا ہے جن کے پاس رسوخ اور دولت ہے۔ یہ ہم جیسی ناتواں عورتوں کی مدد نہیں کرتا۔'' اپنے ناول ''پدم راگ'' میں انہوں نے کچھ سچے قصے بھی لکھے ہیں جو انہوں نے سخاوت میموریل اسکول کی ہندو اور عیسائی استانیوں سے سنے تھے۔ ان قصوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان طبقوں کی عورتیں بھی اپنے نگرانوں کے جبر کی گرفتار تھیں۔

جیسا پہلے بھی ذکر ہوا، رقیہ کے خیال میں جب تک پورے معاشرے کی حالت نہ بدلے صرف عورتوں کی حالت نہیں بدلی جاسکتی۔ رقیہ کا معاشرہ، ہندوستان کا پورا معاشرہ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ بی بی جنہوں نے پردے میں رہ کر خود ہی تعلیم حاصل کی، تعصب کی تنگ نظر سے بلند ہو کر یہ کہتی ہیں: ''یاد رکھیے، ہم ہندوستانی پہلے ہیں، ہندو، مسلم اور سکھ بعد میں۔ ہر اچھی خاتون خانہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں اس بات کا شعور پیدا کرے۔'' حیرت اس لئے کہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا مسلمانوں کے قانونی اور سیاسی حقوق کی نگہداری کے لئے قیام عمل میں آیا۔ مسلمانوں کی سیاسی وابستگی غیر مذہبی کی طرف سے مذہبی وفاداری کی طرف ہوتی گئی۔ رقیہ نے اپنی زندگی میں بدترین ہندو مسلم فسادات دیکھیے۔ ۱۹۳۰ء میں اردو کے مشہور شاعر اقبال نے ایک الگ مملکت کا خیال پیش کیا۔ رقیہ اس علیحدگی کے حق میں نہیں معلوم ہوتیں۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کی دلچسپی سیاسی مسئلوں میں نہ تھی۔ رقیہ کے اپنے پختہ سیاسی تصورات تھے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ اتنی بیدار مغز اور باشعور خاتون سامراجی راج میں خود کو بے حد مجبور اور بے بس محسوس کرتی ہوگی۔ روزنامہ ''مسلمان'' کے ایڈیٹر کو مبارکباد دیتے ہوئے انہوں نے انگریزی میں یوں لکھا: ''جس کسی کو عوام کی سطح پر کچھ کام کرنے کا تجربہ ہے اسے یہ بھی بہت اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اپنے ملک کی خدمت کرنا کس قدر دشوار ہے۔ خاص طور پر جب عوام کا مفاد حکومت کے مفاد سے متصادم ہو۔'' مردوں کے زیر اثر معاشرے میں رقیہ کو خود ایک تصادم کا سامنا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد ان کے سرگرم کارکن اور عورتوں کی حمایتی ہونے کے دوہرے کردار میں اور بھی شدت آ گئی۔

''سلطانہ کے خواب'' کی اشاعت کو اسی برس گزر چکے ہیں اور رقیہ کے انتقال کو پچاس برس سے کچھ اوپر۔ رقیہ کو اپنی زندگی میں ان کے دوہرے کام، ایک سرگرم کارکن اور عورتوں کے حقوق میں آواز بلند کرنے والی کی حیثیت سے شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا اور بے شمار تحسین بھی ان کا حصہ بنی۔ ان کے بعض ہم عصروں نے ان کے کیا کیا نام نہ دھرے۔ کبھی انہیں بے شرم، کبھی باغی اور کبھی عیسائی مشنریوں کے بھرے پر مخرب اخلاق باتیں پھیلانے کا الزام لگایا گیا۔ ان کی تحریروں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے عورتوں کو حکم عدولی پر بھڑکانے کے لئے ان کا استعمال کیا۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے جن کے خیال میں رقیہ ایک نئے اور جدید مسلم بنگال کی روح رواں تھیں۔ وہ اپنے معاشرے کے لئے باعث فخر تھیں اور نئے سویرے کا اجالا۔ ان کے انتقال کے تھوڑے عرصے بعد ہی رقیہ کے ہم عصر نوجوان مرد اور کچھ عورتیں بھی ان کے مقصد کے موثر وکیل اور حمایتی بن گئے۔ ۱۹۱۱ء میں ترکی کے سلطان کی معزولی کے بعد ترکی کے خدوخال جس طرح جدید ہوئے اور ترک عورتوں کو پردے سے جس طرح آزادی ملی اس نے بنگال کے سراجی (۱۹۳۱۔۱۸۸۰) ترکی گیا اور ترک عورتوں نے قومی تعمیر میں جس طرح شرکت کی اس سے بے حد متاثر ہوا۔ بنگال کے مرد مصنفین جیسے نذر الاسلام، منیر الزماں اسلام آبادی اور ابراہیم خان، خواتین میں شمس النساء محمود، ممتاز ماہر تعلیم اور شاعرہ صوفیہ کمال جیسے لوگوں نے عورتوں کی تعلیم اور پردے کی پابندی میں نرم رویہ اختیار کرنے کے لئے انتہائی خلوص سے آواز اٹھائی۔ ان سب کی مشترک کوششوں سے اونچے طبقہ کے مسلمانوں میں پردے سے متعلق رویوں میں تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔ اونچے اور متوسط طبقہ کی عورتیں آہستہ آہستہ پردے کی سختی سے آزاد ہونے لگیں اور انہوں نے رسمی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور مختلف پیشوں میں شامل ہونے لگیں۔

آج کے روشن خیال بنگلہ دیشی رقیہ کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ عام طور پر وہ ان کی برسی پر انہیں یاد کر کے زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ بھی سچ ہے ان کے مضامین اسکولوں میں بنگلہ زبان کے نصاب میں شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن مضامین کا انتخاب

کیا گیا ہے وہ عام سماجی ومعاشرتی مسئلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالخصوص عورتوں سے متعلق وہ مضامین جن کا یہاں ذکر ہوتا رہا ہے اس میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تحریریں نایاب ہوگئیں۔ بنگلہ دیش بننے کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۷۳ء میں بنگلہ اکیڈمی نے رقیہ رچناولی شائع کرنے کی زحمت اٹھائی۔ اقوام متحدہ نے ۱۹۸۵۔۱۹۷۵ کو عورتوں کی دہائی قرار دینے تک رقیہ کی تحریروں میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ۱۹۸۱ء سے بنگلہ دیشی عورتوں کی حالت اور حیثیت پر مرد اور خواتین دونوں صاحبانِ علم نے توجہ دینا شروع کی۔ عورتوں کے حقوق کی علم بردار موجود نسل نے اس بات کو محسوس کیا کہ اپنی تمام تر مجبوریوں اور حد بندیوں کے باوجود رقیہ کی تحریروں کا استدلال آج بھی اپنی جگہ برمحل ہے۔ خاص طور پر اکثر مسلمان ممالک میں بنیاد پرستی کے جن رجحانات کو جس طرح ہوا دی گئی ہے رقیہ کا یہ خواب کہ عورتوں کو بھی اختیار کی طاقت میسر ہو، اس موجودہ نسل کا بھی خواب ہے۔ اقوام متحدہ کی ان تقریبات میں جہاں عورتوں سے مختص دہائی کے ختم ہونے پر اظہار خیال کیا گیا اس بات پر خفگی اور مایوسی کا بھی اظہار کیا گیا کہ رقیہ کی کوشش کے اعتراف کے طور پر ان کے معاشرے نے ان کی ایک یادگار تک نہ بنائی۔ لیکن آخر صرف ایک یادگار کی ضرورت پر اصرار کیوں؟ کیا ہر تعلیم یافتہ بنگلہ دیشی خاتون اس غیر معمولی خاتون کی زندہ یادگار نہیں ہے۔

حنا پاپا نیک

شیر کو پنجرے میں پابند کرنا

(ہمارے زمانے کی ایک کہانی)

سالوں پہلے لکھی ہوئی رقیہ سخاوت حسین کی کہانی ہمارے زمانے کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب بہت سے ممالک اور عقیدوں میں ایسی معاشرتی اور مذہبی تحریکیں وجود پا رہی ہیں جو عورتوں کو یہ بات سمجھانا چاہتی ہیں کہ صرف مرد ہی صحیح سوچ سکتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں عیسائی، مسلمان، ہندو، یہودی اور بدھ بنیاد پرست بھی کچھ اسی طرح کا پیغام دینے کی کوشش میں ہیں۔ دیکھنے میں یہ بڑی سادہ سی صورت حال ہے: پوری دنیا میں کہیں نہ کہیں معاملہ گڑ بڑ ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ عورتوں پر ان کی ''حیثیت واضح'' کر دی جائے۔ وہ حیثیت جو اکثر عورتوں کو اپنے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

رقیہ کا سب سے اہم پیغام اسی صورتحال کے لئے ہے۔ وہ عورتوں کو ان کی اپنی شناخت سے بے حسی اور اپنے مفادات کے مطابق عمل نہ کرنے پر تنبیہ کرتی ہیں۔ اس پیراگراف میں جہاں گائیڈ خواب دیکھنے والی کو بتاتی ہے:

''تم خود کو پابند ہونے کی اجازت کیوں دیتی ہو؟ تمہاری ذات کے جو فرائض تم پر قرض ہیں، تم نے ان کو کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔ اپنے مفادات کے بارے میں تم لوگوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اسی لئے تم لوگوں نے اپنے فطری حقوق بھی گنوا دیے۔''

یہ رقیہ کے پڑھنے والوں کے لئے تلقین بھی ہے اور رقیہ کی عورتوں کی تعلیم سے جذباتی وابستگی کا ثبوت بھی، یہ بات آج بھی کچھ کم معنی خیز نہیں ہے۔

عورتوں کی زندگی میں آنے والا یہ خاموش انقلاب جہاں مٹھی بھر عورتوں سے زیادہ نے تعلیم اور آزادی حاصل کی، پھر دھمکیوں کی زد پر ہے۔ آج پھر عورتوں کے لئے انتخاب اور اختیار کا حق بالواسطہ طور پر نشانہ ہے۔ دنیا کے ملکوں میں زیادہ سے زیادہ بچیاں اسکول جا رہی ہیں اور گھروں سے باہر نکل کر روزگار تلاش کر رہی ہیں۔ جہاں اسکولوں میں طالبات کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ملازم پیشہ خواتین کے اعداد وشمار میں اضافہ ہو رہا ہے، وہیں یہ بھی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں کہ عورتوں کے لئے انتخاب اور اختیار کے راستے کسی نہ کسی طرح مسدود کر دیے جائیں۔ امریکہ میں جہاں ضبط تولید اور اسقاط حمل کے معاملے میں عورتوں کے حق اختیار پر پابندی کی کوشش ہو رہی ہے اور یورپ میں طلاق کے معاملات میں یہی صورتحال ہے۔ مذہبی روایت کو شخصی ضابطہ اخلاق اور ذاتی طرزِ عمل تبدیلی کے لئے بنیاد بنایا جا رہا ہے۔

بنگال کے مسلمانوں میں رائج پردہ کی رسم رقیہ کا مخصوص موضوع تھا۔ اس مضمون میں، میں ایک وسیع نقطۂ نظر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ پردے کی ایک قطعی تعریف کرنا آسان نہیں ہے۔ پردہ تمام ایسے رسم ورواج کے لئے ایک اشارہ بن گیا ہے جن میں بہت سی باتیں شامل ہو سکتی ہیں جن کا دارومدار خاندانوں کی ترجیحات پر ہوتا ہے۔ چہرے کو نقاب سے ڈھانپنا، خود کو چھپانے کے لئے جبہ پہننا، زنان خانوں میں رہنا اور گھر والے مردوں کے علاوہ کسی اور سے نہ ملنا جلنا، یہ سب کچھ اب دوبارہ رواج پا رہا ہے۔ بہت سے ملکوں میں برقعہ پہننے کی رسم پھر شروع ہو گئی ہے اور بہت سی خواتین مردوں سے راہ رسم رکھنے میں بہت احتیاط برت رہی ہیں۔ جہاں برقعہ نے زیادہ رواج نہیں پایا وہاں عورتوں کے لباس میں ایک نمایاں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ لمبے اسکرٹ، پوری آستینیں، حجاب یہ سب عقیدے اور اس پر عمل کے بارے میں ایک واضح اشارہ ہیں۔

عالمی اور تاریخی تناظر میں پردے کی مخالفت اور حال میں اس کی دوبارہ مراجعت ایک

عجیب متضاد صورتحال پیش کرتی ہے۔ یہ مخالفت اور اس پردے کا دوبارہ احیاء کی بنیاد قومی تشخص پر ہے اور عورتوں کی اس مرکزی اہمیت پر بھی اصرار کہ وہ قومی زندگی کی علامت ہیں۔ دونوں صورتحال سے ایک بات سامنے آتی ہے۔ وہ واقعات جو بظاہر نجی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے جیسے اقتصادی صورتحال میں بڑی تبدیلیاں، سیاسی اور سماجی ڈھانچہ قومی ریاست کی سطح پر بدن جانا ان تمام ڈرامائی تبدیلیوں کو منعکس کرتے ہیں جو اپنی ذات کے تصور اور شخصیت کے عمومی سطح پر پہچانے جانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس صدی کے نصفِ اول میں عورتوں کی آزادی اور پردے کی مخالفت دونوں کا تعلق ان قومی تحریکوں سے تھا جو سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں۔ ان قومی تحریکوں کے رہنما عورتوں کی شمولیت اور شرکت کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان میں وہ عورتیں بھی تھیں جو یوں تو پردہ نہ کرتی تھیں لیکن رسم ورواج اور شرم ان کے آڑے آتی تھی۔ ان قومی تحریکوں میں مسلمان ہندوستانی عورتوں کی شرکت، چاہے رہنما کے طور پر یا پیروکار کی حیثیت سے پردے سے آزادی کے مترادف تھی۔ جدت پسند اور روشن خیال اونچا طبقہ جس میں مسلمان، ہندو، عیسائی سب شامل تھے، اس بات میں دلچسپی رکھتا تھا کہ وہ سامراجی حکمرانوں کو یہ باور کرا سکیں کہ وہ حکومت کا انتظام خود چلانے کے لئے تیار ہیں۔ پردے کی پابندی سے عورتوں کو آزاد کرانے کا معاملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ایک طرف تو جدت پسندی ثابت ہوتی تھی اور دوسری طرف سامراجی حکمرانوں کی پیروی بھی منظور تھی تاکہ خود کو ان جتنا مضبوط اور قوی کہا جا سکے۔

بیسوی صدی کے نصف آخر میں یعنی ۴۰ اور ۵۰ کی دہائی میں جب بیشتر قومیں سامراج سے آزادی حاصل کر چکی تھیں، نقاب اور ستر کا احیاء پھر سے وجود میں آیا۔ خاص طور پر ان ممالک میں جہاں اکثریت مسلمان آبادی ہے۔ مسلمانوں میں یہ تبدیلی ایک وسیع تر مذہبی روایت کے حوالے سے آ رہی ہے۔ یہ قومیت کے ایک نئے تصور کا حصہ ہے۔ قومی تشخص کی توثیق نو جو اسلام کی ایک نئی قومی زندگی سے وابستہ ہے۔ ان تمام قدروں کی نفی جن سے مغربی ہونے کا تصور

پیوست ہے اور جو قومی ضرورتوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ پبلک میں عورتوں سے برتاؤ میں تبدیلی ان نئے تصورات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا ایک اہم اشارہ ہے۔اتنی ہی اہم بات یہ بھی ہے کہ اس طرح اس تصور کی ایک بڑے پیمانے پر تبلیغ کی جاسکتی ہے۔ یہ تبدیلیاں صرف سطحی نہیں ہیں، اس سے کچھ زیادہ ہیں۔ بہت سی عورتیں اب مذہبی سرگرمیوں میں ایک تازہ دلچسپی کا اظہار کر رہی ہیں بلکہ ان میں شرکت کر کے نئی راہیں بھی ہموار کر رہی ہیں جیسے مذہبی علوم کی تحصیل، ماضی میں بہت کم عورتیں علانیہ طور پر ان موضوعات کے متعلق متحرک رہیں۔

مسلمان عورتوں میں پردے کے احیاء کی تحریکوں کا تعلق براہ راست ان تحریکوں سے بھی ہے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں سرگرم ہیں۔اس میں دوسری مذہبی روایتیں جیسے عیسائیت، ہندومت اور یہودیت شامل ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ اور یورپ کے کچھ ملکوں میں ایسی تمام تحریکیں جو اسقاط حمل، طلاق اور ضبط تولید کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں وہ بھی مذہبی تصورات کو عوام کے اخلاق اور ذاتی رویوں کی بنیاد بناتی ہیں۔ یہ تحریکیں نسائیت کے اپنے نظریے کو عامۃ الناس پر عائد کرنے کی فکر میں ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حجاب اور پردے کے احیاء کی بہت سی تحریکوں کی کوشش ہے۔ ان متوازی رویوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ اپنے معانی اور وسعت میں عالمی حیثیت رکھتے ہیں۔

نظریاتی اور مذہبی اختلاف کے باوصف ان تحریکوں کی کوششوں کا مرکز عورتوں کی جنسی اور تولیدی قوت سے ہے جو تحریکیں ضبط تولید اور اسقاط پر پابندی لگانے کے حق میں ہیں، وہاں یہ عنصر زیادہ واضح ہے۔ پردے کے معاملے میں یہ تعلق اتنا براہ راست نہیں ہے لیکن پردے کی حامی بھی جنسی آزادی اور اخلاقی کج روی کو اپنی ترجیحات میں شامل کرتی ہیں۔ جنس اور تولید سے متعلق مسائل عام آدمی کی تحریک کے لئے بہت موثر ہیں۔ ان مسئلوں پر عام لوگ اپنی رائے رکھتے ہیں چاہے وہ کسی اور سیاسی اور سماجی نوعیت کی تحریکوں میں شامل نہ ہوتے ہوں۔ پردے اور حجاب کا احیاء، دنیا کے اکیلے اور دور دراز علاقوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے برابر کے مسئلے ان ملکوں میں بھی

موجود ہیں جنہوں نے پردے کا نام تک نہیں سنا۔

دونوں طرح کی ان تحریکوں میں ایک صفت اور مشترک ہے۔ مذہبی دستور کے لئے جسے کبھی قدیم اور نہ بدلنے والا حکم سمجھا جاتا تھا، پرجوش استدعا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہبی دستور معاشرے میں جتنے مستحکم نظر آتے ہیں اس قدر ان کا رسوخ نہیں ہے۔ عام طور پر یہ شدید اختلافات کا نشانہ بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر پردہ مسلمان آبادی میں بھی مکمل طور پر رائج نہیں ہے اور جہاں ہے بھی وہاں اس کے طور طریقے اور ان پر پابندی کی شدت میں بھی اختلاف ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک میں اس کی نوعیت بدلتی رہی ہے اور پردہ کی روایت کبھی اس قدر پائیدار روایت نہیں رہی۔ دوسرے مذاہب میں بھی اسی طرح اسقاط اور ضبط تولید سے متعلق نظریات وقت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ پچھلی چند صدیوں میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے لیکن اب موجودہ دور میں ان نظریات کو اس یقین اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ ہمیشہ سے اسی طرح من وعن موجود تھے۔

یہ تمام مماثلتیں ایک واضح اشارہ دیتی ہیں۔ آج کی سماجی اور مذہبی تحریکوں کی بنا جن تصورات پر ہے انہیں ساختہ روایت کہا جاسکتا ہے۔ یہ تحریکیں اپنے دور کی ضرورتوں اور مقاصد کا احاطہ کرتی ہیں لیکن اپنی طاقت ثابت کرنے کے لئے انہوں نے خود کو قدامت کے لبادے میں لپیٹ رکھا ہے۔ انہیں چیلنج کا سامنا ہے۔ خاص طور پر ان خودساختہ روایتوں کے حوالے سے جو براہ راست عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں لیکن یہ چیلنج بڑی سست روی سے وجود میں آرہے ہیں۔

عورتوں پر اثر انداز ہونے والی ان خودساختہ روایتوں کے چیلنج کی ترقی میں ایک مخصوص مسئلہ الجھاؤ پیدا کرتا ہے جس سے مشکلیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ پردے کے احیاء اور تولیدی حق پر پابندی دونوں معاملوں میں ایک خیال مشترک ہے اور وہ ہے عورتوں کی ایک ''مخصوص حیثیت'' کا خیال، اس خیال کے مطابق عورتیں مردوں سے مختلف ہیں۔ وہ ''فطرت سے قریب تر'' ہوتی ہیں اور ''روایتوں کی امین'' ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے خاندانی زندگی میں ان کا کردار غیر معمولی ہوتا

ہے۔ مذہبی روایتیں اس غیر معمولی حیثیت کی اکثر تائید کرتی ہیں۔ عورتوں کے غیر معمولی ہونے کا تصور ناگزیر طور پر ان تصورات سے وابستہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں نہ کہ اس پر کہ دونوں برابر ہیں۔

غیر معمولی حیثیت کے اس تصور کو بہت سی عورتوں کی حمایت حاصل ہے۔ شاید اس لئے کہ اس طرح وہ قوت کا سر چشمہ کہلائی جا سکتی ہیں۔ پردے کے احیاء سے سے متعلق یہ نئی خود ساختہ روایتیں، عورتوں کے نیب عورتوں کی یونین ہے۔ سیوا کے ایک کنونشن میں فہمیدہ بی نے یہ کہانی خود سنائی تھی۔

مہمیدہ بی، بھوپال کے سیوا گروپ کی منتخب سربراہ تھیں۔ یہ گروپ بھوپال کی بیڑی بنانے والی عورتوں نے بنایا تھا۔ ان کا گھر کچی آبادی میں دو کمروں کا تھا، جہاں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے جیسا کہ بھوپال کے مسلمانوں کا طریقہ تھا فہمیدہ بی پردہ کرتی تھیں اور برقعہ اوڑھتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ بیڑی بنانے کی گھریلو صنعت میں کام کرتی تھیں۔ جب سیوا کے علاقائی دفتر سے میٹنگ کا بلاوا آیا تو فہمیدہ بی اپنی یونین ممبروں کے کہنے سننے سے جانے کو تیار ہوئیں لیکن اس شرط پر کہ ایک اور عورت ان کے ساتھ جائے۔

جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ سامان اٹھائے ریلوے اسٹیشن جا رہی تھیں تو ان کی کچھ یونین ممبروں نے پکار کر پوچھا: ''اور برقعہ اوڑھ کر تم انقلاب لے آؤ گی؟'' فہمیدہ بی بی وہیں سے پلٹیں۔ گھر گئیں اور بغیر برقعے کے واپس آئیں۔ بیٹے کے طور طریقوں سے ظاہر تھا کہ اسے ماں کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ انہوں نے کانفرنس کو بتایا: ''مجھے یہ خیال تھا کہ انہوں نے مجھے یہاں بھیجنے کو چنا، اس لئے مجھے ان کی بات مان لینا چاہیے۔'' ریل گاڑی کی کھڑکی سے اپنے ناراض بیٹے کو دیکھ کر انہوں نے خود سے سوال کیا، ''کیا میں نے کوئی برا کام کیا؟'' پھر خود کو یہ سوچ کر تسلی دے لی کہ اس کا بیٹا اس قدر ناراض نہیں رہ سکے گا جب اس کی بیوی یا بیٹی نے بھی برقعہ اتار کر پھینک دیا۔

اسی کانفرنس میں ایک اور عورت نے کھڑے ہو کر بیڑی بنانے والی عورتوں کے ایک گروپ کو یہ صلاح دی: ''تم سب لوگ پردہ کرنا چھوڑ دو، تم کو تو کم سے کم اجرت کے قانون کا بھی فائدہ نہیں ملتا کیونکہ تم لوگ خود تو بات چیت کرتی نہیں ہو، اپنے بچوں کو بیوپاریوں کے پاس بھیجتی ہو انہیں اجرت کم ہی ملنا چاہیے''۔

حمیدہ خالہ اور فہمیدہ بی سماجی اور اقتصادی سطح کے دو مختلف کنارے ہیں حالانکہ فہمیدہ بی غریب ترین نہیں ہیں اور حمیدہ خالہ امیر اور مہذب ترین نہیں۔ ان دونوں کی سرگزشت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور مختلف زمانوں میں پردہ کی عمل داری کیا ہوتی ہے۔ فہمیدہ بی نے ۱۹۸۰ء میں قدم اٹھایا اور حمیدہ خالہ نے ۱۹۳۰ء۔۱۹۲۰ میں۔ حمیدہ خالہ کے لئے روزگار نہ ضرورت تھا نہ انتخاب۔ فہمیدہ بی کے لئے دونوں ہی تھا۔ دونوں کی صورت حال میں پردے کا تعلق مذہبی جذبات سے وابستہ تھا اور عزت کے اس تصور سے جو برادری یا معاشرے میں ملتی ہے۔ دونوں عورتوں نے جو قدم اٹھائے اس سے ان کے حالات کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔

پردہ کی تعبیریں: سماجی نظام کا الجھاؤ:

رقیہ سخاوت حسین جنوبی ایشیا میں پردے کے متعلق لکھنے والی پہلی مصنف نہ تھیں، نہ ہی اس کی مخالفت کرنے میں پہلی خاتون تھیں مگر میں کسی اور کو نہیں جانتی جس نے اتنی شدت سے اس معاملہ کو محسوس کیا ہو اور اتنی ہی شدت سے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا ہو۔ جن لوگوں نے بھی پردے کے متعلق لکھا ہے ان میں سے غیروں کے بیان تو انتہائی تنقیدی ہیں اور اس کے مقابلے میں اپنوں کے اخلاقی۔ غیر ایشیائی لوگوں کے لئے پردہ اپنی جگہ ایک مخصوص انفرادیت رکھتا ہے جیسا کہ میرا اپنا تجربہ تھا۔ ایشیا کے دوسرے تصورات پر پردہ غالب رہتا ہے۔ وہ جو خود پردہ نشین ماحول کی پیداوار ہیں ان کے لئے یہ بات اتنی غیر اہم ہے کیا کہیے۔ ہاں اگر واعظان اخلاق ذکر کر دیں تو فبہا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ایک انگریز خاتون نے جس کی شادی ایک مسلمان

ہندوستانی سے ہوئی تھی ان شہری زنان خانوں کی زندگی کے متعلق لکھا تھا۔ جہاں تک اپنے شوہر کے خاندانی مراسم کی وجہ سے ان کی پہنچ تھی۔ عزلت نشین عورتوں سے ملاقات میں اس کے لئے ایک عجب طرح کی دلربائی تھی لیکن گفتگو کا لطف مردوں سے تھا جن سے وہ تقابل مذاہب کے موضوع پر بات چیت کرسکتی تھی۔ عورتوں کے لئے ان کا رویہ مربیانہ تھا۔ ہندوستانی رسم ورواج سے واقفیت بھی واجبی ہی سی تھی لیکن بعد میں آنے والے دوسرے انگریزوں کے مقابلے میں طبیعت میں برداشت اور رواداری زیادہ تھی۔ بیگم میر حسن علی نے پردے کے رسوم وعقائد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان تبدیلیوں اور مماثلتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو شمالی ہند میں رائج تھے۔ مثال کے طور پر وہ برقعہ کا ذکر ہی نہیں کرتیں اور نہ شاید انہوں نے کسی کو اوڑھے دیکھا۔ یہ بات اس دلیل کو مضبوط کرتی ہے کہ پردہ کی کوئی مستقل حیثیت نہیں تھی۔

تقریباً ایک صدی بعد ایک غیر ملکی مبصر نے پردے کی کچھ اور ہی کیفیت لکھی۔ کیتھرین میو کے مقاصد واضح طور پر سیاسی تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی آزادی کی تمنا کا تمسخر اڑانا چاہتی تھیں۔ خاندانی زندگی، جنس اور عورتوں کے متعلق سنسنی خیز تحریروں سے ان کا منشاء ان کمزوریوں کو بے نقاب کرنا تھا۔ ان کی انتہائی اخلاقی تحریریں پردہ اور کم سنی کی شادی پر مرکوز ہیں جسے وہ ''گھر کی چاردیواری میں عمر قید'' سے تعبیر کرتی ہیں۔ اپنے مخصوص انداز کی ایک تحریر میں وہ لکھتی ہیں کہ ہندوستانی ''نسلی زوال سے انکار نہیں کرسکتے۔'' جس کی وجہ حد سے زیادہ ''جنس پرستی'' ہے جس نے ''ان کے ہاتھوں کو..... اس قدر کمزور کردیا ہے کہ وہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے زمام حکومت نہیں سنبھال سکتے۔'' اور ''وقت کے اس لمحے میں جبکہ انگریزوں کی مردانگی اپنے عروج پر ہے۔'' میو کی تحریروں کو عورتوں کے حقوق کی علم بردار جدید لکھنے والیوں نے بہت سراہا ہے لیکن ان کا کھلم کھلا سیاسی جھکاؤ اور نسلی تعصب انہیں قابل اعتبار مصنف نہیں ٹھہراتا۔ ہندوستانی معاشرے کے موضوع پر میو کی کتاب کا لب ولہجہ، حیرت انگیز حد تک ان ایشیائی مبلغین اخلاق کی تحریروں سے مماثلت رکھتا ہے جو پردے کے لئے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اخلاقی بے راہ روی کے سدباب کے لئے یہ

ناگزیر ہے۔

مسلمانوں کے ایک بہت سرکردہ عالم جنہوں نے پردے کی حمایت میں بہت کچھ لکھا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ ان کی تحریریں جنوبی ایشیا میں ہی نہیں پوری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔ ۱۹۳۹ء مودودی صاحب کی پہلی تحریر پردے کے متعلق آئی۔ پاکستان میں اس کا انگریزی متن ۱۹۷۲ء میں چھپا۔ مودودی کا انسانیت کے متعلق ثنوی نظریہ یوں ہے: ''دنیا میں جس قدر بھی عمل وجود میں آتے ہیں ان کا وجود اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ایک رفیق فعال اور ایک رفیق غیر فعال نہ ہو۔ مجہول رفیق کی خصوصیات سپردگی اور دست برداری کی ہوتی ہیں۔'' مردوں کے لئے مزارع اور عورتوں کے لئے مزرع کا تصور مسلمانوں میں عام ہے اور مودودی صاحب کی تحریروں میں اکثر دہرایا گیا ہے۔ دوسری عبرت آموز تحریروں کی طرح مودودی صاحب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کا تعلق معمول کی دانش سے ہے جس سے کوئی بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ مودودی دستبرداری کا اتنا اعلان ضرور کرتے ہیں۔ ''فعالیت فطری طور پر مجہولیت اور نسائیت سے برتر ہے۔ یہ برتری مردانگی کے کسی جوہر یا نسانیت کے کسی نقص کی وجہ سے نہیں ہے۔''

اگر ایسے بیان مغرب کے قاری کو نامانوس نہیں معلوم ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی طرح کی ثنویت زمانہ قدیم سے عیسائیت اور یہودیت کی روایتوں میں موجود ہے۔ میں نے اس مضمون میں جن اصطلاحوں کا استعمال کیا ہے وہ بھی عورتوں کی مخصوص فطرت کا دعویٰ کرتی ہیں اور اسی ثنوی فلسفیانہ روایت کی عکاس ہیں۔ ان کا براہ راست تعلق ان عصری چیلنجوں سے ہے جو ان تحریکوں کے احیاء کی بدولت سامنے آئے ہیں جو مرد اور عورت کے متعلق ایک ثنوی نظریہ پیش کرتی ہیں۔

کچھ عرصہ سے خواتین مذہبی عالم عیسائیت اور یہودیت میں موجود ثنوی روایت پر تنقید کر رہی ہیں۔ مثلاً روزمیری ردتھر کے تجزیہ کے مطابق سینٹ آگسٹن نے روح اور جسم کی ثنویت کو

مذکر اور مونث کی ثنویت کے مترادف قرار دیا۔''اس طرح خدا کا روحانی تصور...... مردوں میں لازماً تذکیر بن کر آیا اور نسائیت کو ایک پست اور مادی سطح کی چیز سمجھا گیا۔''اسلام میں بھی اسی طرح کی ثنویت کے دلائل حال ہی میں پیش کیئے گئے ہیں۔ مسلمان خاتون مذہبی عالم رفعت حسن کی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں ثنویت، عیسائیت اور یہودیت کی روایت سے قرآن کی تفسیروں میں در آئی حالانکہ ثنویت کا یہ تصور خود قرآن کے لئے اجنبی ہے۔ رفعت حسن نے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ عورت کا جسم ہی اس کی اصل سمجھا جاتا ہے اور اس کا تعلق بھی ذہن اور جسم کی اس ثنویت کے تصور سے ہے جہاں تذکیر و تانیث کی تفریق واضح ہے۔ اس بات کو مان لینا کہ ثنویت کا تصور عیسائیت اور یہودیت کی روایت کی میراث ہے، بذات خود بڑی طعن آمیز بات ہے کیونکہ احیائے اسلام کی نئی تحریکیں اسی روایت سے شعوری طور پر فاصلہ رکھنا چاہتی ہیں۔

عورتوں کے متعلق مودودی کا نظریہ بھی چیلنج کیا گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۰ء میں ایک پاکستانی مرد مصنف نے پردہ کے تجزیے پر ایک پوری کتاب لکھ ڈالی کیونکہ اس کا یقین یہ تھا کہ ''پردہ اور کثرت ازدواج بنیادی طور پر مسلمان معاشرے، تہذیب اور ثقافت کی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔''اس زاویہ خیال کو شہری علاقوں میں خاص طور پر بہت پذیرائی ملی۔

ابھی حال ہی میں مسلمان آبادی کی اکثریت والے ممالک میں عورتوں کی حیثیت کے بارے میں تصورات میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ قومی اور مضبوط سیاسی وسماجی تحریکوں نے عورتوں کی قسمت پر حکومت پر اس طرح اثر انداز ہونا شروع کیا ہے کہ ان تحریکوں کے حق میں پالیسیاں نافذ کی جائیں۔ پاکستان کی مثال لیتے ہوئے حالانہ وہی صرف ایک ایسا ملک نہیں ہے جہاں یہ واقعہ ہوا، ۱۹۸۰ء میں حکومت کے احکامات نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ جو حقوق پہلے میسر تھے انہیں یا تو محدود کر دیا جائے گا یا سرے سے تفویض ہی نہیں کیئے جائیں گے۔ اس کا آغاز سرکاری ملازمتوں کے لئے اس حکم سے ہوا کہ وہ دفتروں میں اسلامی لباس پہن کر آئیں۔ اس کا اطلاق تعلیمی درسگاہوں کے لئے بھی تھا۔ عام طور پر تو ان احکامات کی کوئی خاص پرواہ نہیں کی گئی لیکن اس

سے ان جوشیلوں کو بڑھاوا ملا جنہوں نے پبلک میں عورتوں کے لباس کے لئے اپنی مرضی کے احکام صادر کرنا شروع کئے۔ ان پالیسیوں کے تعارف سے مدعا تو یہ تھا کہ لوگ مغرب کے طور پر طریقوں کو چھوڑ کر اپنی ثقافتی قدروں کو اختیار کریں مگر نقادوں کی نظر سے یہ بات چھپی نہ رہی کہ دراصل عورتوں پر سختی پر تھی'' کہ وہ لباس اور وضع قطع کی اس روش کی پیروی کریں جو مردوں کے لئے تو متروک ہو چکی تھی۔ اس سے مراد صرف عورتوں کی آدھی آبادی پر اس طرح کی قیدو بند کو لازم کرنا تھا۔ مختصراً یہ کہ پردے کی آڑ میں دراصل ان کوششوں کے سلسلہ کی شروعات تھی جن سے عورتوں کے حقوق محدود ہو سکتے تھے اور عورت اور مرد کے درمیان علیحدگی قائم ہو سکتی تھی۔ عورتوں نے اس کا جواب احتجاج سے دیا۔ پرانے اور نئے دونوں گروپوں نے اس صورتحال کے خلاف مظاہرے کئے لیکن ان کا یہ احتجاج اس لئے بے سود رہا کہ وہ ان قوانین کو نافذ ہونے سے نہ روک سکیں جنہوں نے عورتوں کے قانونی حقوق بڑی حد تک مسدود کر دیے۔

جنسیت اور معاشرتی ابتری کا خوف:

پردے کے حامی مرد عورت کی جنسی کشش سے بہت زیادہ خائف ہیں اور پھر یہ سوال کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ان کا خیال ہے کہ عورتوں اور مردوں کا ارتباط جس قدر کم ہوگا اسی قدر معاشرہ اخلاقی ابتری سے مامون رہ سکے گا۔ جیسا کہ مودودی صاحب نے کہا: ''دونوں صنفوں کے مابین فطری طور جبلی جنسی کشش تو موجود ہے اور یہ اور بھی شدید ہو جاتی ہے اگر عورتوں اور مردوں کو بے تکلف ارتباط کا محرک میسر آ جائے۔'' عورتوں اور مردوں کی کڑی علیحدگی کے حق میں پردے کے حامی یہی کہتے ہیں کہ مغرب میں فحاشی، بے راہ روی، طلاق اور ناجائز تعلقات کی وجہ یہی اختلاط ہے۔ یہ باتیں اخباروں اور رسالوں سے لی جاتی ہیں اور ایسے اخبار، رسالے جو بین الاقوامی سطح پر پڑھے جاتے ہیں اور جنہیں روزمرہ کے واقعات کا پیمانہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ مودودی صاحب جن کی تحریریں بہت اہم ہیں کیونکہ ان کا دائرہ اثر بڑا ہے ایسی بہت سی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جنہیں وہ مغرب کے ملکوں میں ''قومی خودکشی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ (خاص طور پر فرانس،

انگلستان اور امریکہ) ان کے خیال میں اس کی وجہ ''ان تمام تحریکوں کے منطقی نتائج ہیں جو انیسویں صدی عیسوی میں عورتوں کی آزادی اور حقوق کے لئے ظہور میں آئیں۔''

اسی طرح ماضی کے سنہرے دنوں کی طرف پلٹنے کا نعرہ عیسائیت اور یہودیت کے بنیاد پرستوں کے یہاں بھی موجود ہے لیکن مسلمانوں کو جنس کی جو دھن سوار ہے اسے ایک اور زاویے سے بھی دیکھنا پڑے گا۔ آج کل عورتوں کی علمبردار، مسلمان خاتون مصنفین اس بات کو سمجھتی ہیں کہ عورتوں کی مجہولیت اور جنسی کشش کا تعلق سنجیدہ سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ ''میں جس مسلمان معاشرے میں رہتی اور کام کرتی ہوں وہاں عورتوں کے حسن کے لئے کلیدی پیمانہ، خاموشی، بے حرکتی اور اطاعت گزاری کیوں ہے؟ فتنہ صباح پوچھتی ہیں یہ اس مسلمان خاتون کا قلمی نام ہے جس نے ''مسلمان لاشعور میں عورت'' کے عنوان سے کتاب لکھی۔'' اسلامی لٹریچر کے مستند حوالوں میں کچھ یوں ہے کہ وہ عورت جو خود خاموش رہتی ہو، مردوں کے لئے بڑی ہیجان انگیز کیوں ہوتی ہے؟'' یہ ایک بہت بڑا اور اختلافی مسئلہ ہے۔ اس پر بحث کرنے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ لیکن صباح کے اس سوال پر ابولغود کی اس تشریح سے کچھ روشنی پڑتی ہے جو اس نے مصری بدوؤں کے عزت اور پردے کے تصور کے متعلق پیش کی ہے۔ ''جنسیت مردانہ معاشرے کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے اور ان کے لئے خاص طور پر جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں، تولیدی صلاحیت کی وجہ سے عورتوں کا تشخص اس جنسیت سے منسوب ہے۔ اس لئے اس سماجی نظام کی تکریم اور اس نظام کے نمائندوں کی تعظیم کی خاطر عورتوں کو اپنی جنسیت سے منکر ہونا چاہیے۔ وہ جنس سے لاتعلق ہونے کا مظاہرہ اس طرح کرتی ہیں کہ مردوں میں عدم دلچسپی اور گریز، اس طرح کا لباس اختیار کرنا جو ان کی دلربائی کی طرف متوجہ نہ کر سکے اور پھر خود کو پردے میں چھپالینا'' یہ تو ضیح اسی مصنفہ کی اس دلیل سے بالکل متفق ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا کہ ''از خود پاس ولحاظ کرنا''، ماتحتوں، دست نگروں کی اخلاقی خوبی ہوتی ہے۔'' اپنے معاشرے کی اصطلاحوں میں بیان کردہ یہ خیال وہ ہیں جو کسی بھی منظّم معاشرے میں جنسیت کے تصور کو ہیجان اور مطلق العنانی کے

ہم معنی قرار دے دیتے ہیں۔ وہ مطلق العنانی جو سطح کے قریب تر ہے اور جس پر مسلسل نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

عورتوں اور جنسیت کی اس نفسیاتی اور علامتی اہمیت کے ماسوا مردوں کے زیر اختیار معاشروں میں ایسی ٹھوس حقیقتیں موجود ہیں جو جنس اور تولید پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں میں اولاد کا جائز ہونا، ورثہ کے اختیار اور معاشرے کے نظم وضبط کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں اولاد کے جائز ہونے کا مسئلہ، شادی، طلاق اور وراثت کے معاملے میں بہت اہم ہے۔ صرف جنسیت ایک یقینی خطرہ بن جاتی ہے کیونکہ ایک دوسرے کی کشش، ماں باپ کے ان منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی ہے جو انہوں نے شادی کے سلسلے میں قرابت داری کے خیال سے سوچے ہوں۔ مسلمان عائلی قوانین کی رُو سے عورتیں قانوناً جائداد کی وارث ہوتی ہیں (گو کہ عام طور پر انہیں ان کا حق ملتا نہیں ہے)۔ بیٹی وراثت میں ملنے والی جائداد کی وجہ سے خاندان کے احاطہ اختیار سے باہر ہو سکتی ہے۔ باپ کی طرف سے عم زادوں میں شادی کرنے کے رجحان کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ خاص طور پر بھائیوں کی اولاد کے درمیان تا کہ خاندانی جائیداد پر مشترکہ اختیار قائم رہ سکے جنسیت کا، مختصر طور پر صرف عائلی زندگی میں جواز شرعی موجود ہے۔

پردہ اور عورتوں کے فطری حقوق:

آخر میں، میں آغاز کی طرف پلٹتی ہوں۔ رقیہ کا اپنے پڑھنے والوں کے نام پیغام ہے: اپنی ذات کے مفادات کو پہچانیں اور اپنے بنیادی حق حاصل کریں۔ میرے خیال میں رقیہ کی اپنی کہانی اور بعد کی دوسری تحریروں کی اصل اہمیت بھی یہی ہے۔ پردہ صرف برقعہ اوڑھنا اوڑھنا نہیں ہے۔ یہ آدھی آبادی کو دنیا سے الگ کرنے کا ایک حربہ ہے۔

''سلطانہ کے خواب'' میں رقیہ نے پردے کو سر کے بل کھڑا کر دیا۔ اپنے پڑھنے والوں کو انہوں نے چونکایا۔ پردے کی اس متضاد صورت سے، معاشرے کی صنفی علیحدگی کے بہت سے

پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پردے کی یہ الٹ صورت رقیہ کے پڑھنے والوں کے خیال میں آسکتی تھی۔ ایک ایسی دنیا، جہاں مردوں کا وجود تک نہ ہو (شارلٹ پرکنز گل مین کے ''ہرلینڈ'' کی طرح) یا وہ منصف ومساوی دنیا جس کا ہونا ممکن نہیں۔ رقیہ نے اس طرح کھل کر بات نہیں کی جس طرح وہ کرسکتی تھیں۔ ''عورتوں کی دنیا'' میں مردوں کی قید کا کیا ظالم نتیجہ نکل سکتا تھا۔ بجائے اس کے کہ عورتوں کی دنیا ان عورتوں کے لئے کیا معنی رکھتی تھی جو پہلے قید و پابندی میں رہ چکی ہوں۔

جھنجوڑنے کی اس صفت کے علاوہ رقیہ کی کہانی براہ راست ان تصورات کو چیلنج کرتی ہے جو ان کے پڑھنے والوں کو خاندانی اور معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے سکھا دیے گئے۔ اس چیلنج نے دو شکلیں اختیار کرلیں: ایک تو عورتوں کو اپنے نفع نقصان پر نظر رکھنے کی دعوت اور دوسرے اس بات کا عملی ثبوت کہ گھر سے باہر کی دنیا میں بھی عورت کسی سے کم نہیں۔

رقیہ کے عہد کی جنوبی ایشیا کی خواتین کو اپنی ذات کا جو تصور دیا گیا تھا اور جو بہت سے لوگوں میں آج تک موجود ہے وہ ایک خود مختار فرد کا تصور نہیں ہے بلکہ ایک خاندان کے ایسے فرد کا تصور ہے جس کے اجتماعی مفادات دوسرے افراد کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ اس زاویے سے ان ''فطری حقوق'' کی گنجائش بہت کم ہے جو ''سلطانہ کے خواب'' میں رقیہ کے ذہن میں ہوں گے۔ جہاں ایک قانون کا مفاد، خاندان کے مفاد سے اس طرح سختی سے پیوست ہوگا وہاں یہ سوچنا محال ہے کہ ایک عورت، خاندان کی ترجیحات کے خلاف عمل کرسکتی ہے۔

مگر رقیہ باغی اور مصلح، اسی ماحول کی پیداوار تھیں اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان جیسی اور نہ تھیں۔ آج جب عورتیں اپنی ماؤں، نانیوں، دادیوں، خالاؤں اور پھوپھیوں کی زندگی کے قصے سناتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ خاموش بغاوت اور کشیدگی کے دھارے ان جگہوں پر بھی تھے جہاں کسی کو توقع نہ تھی۔ اگر اور بہت سی رقیہ ہوتیں تو ہمیں ان کا بھی علم ہوتا ان سوانح عمریوں، آپ بیتیوں سے ہوتا جن کا چرچا اس وقت پورے جنوبی ایشیا میں ہے اور جو اس قابل ہیں کہ ان کا انتظار کیا جائے۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org